المنار

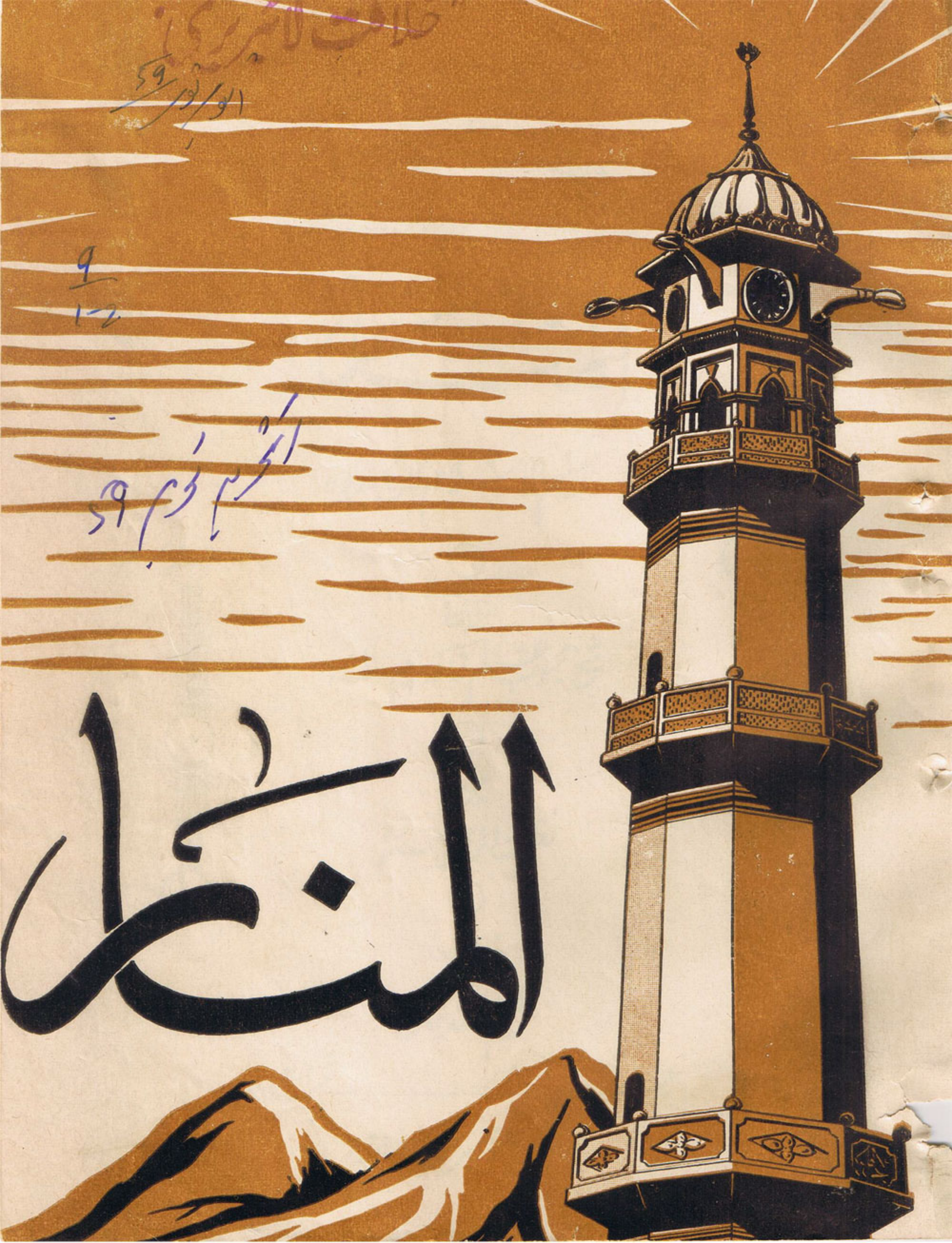

خلافت لائبریری

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وَمِمَّنْ خَلَقْنَا أُمَّةٌ يَهْدُونَ بِالْحَقِّ وَبِهِ يَعْدِلُونَ

(قرآن کریم سورۃ اعراف)

المنار

تعلیم الاسلام کالج ۔ ربوہ

علم و عمل

علم و عمل

نگران

شیخ محبوب عالم خالد ایم۔ اے

مدیر

لطف الرحمٰن محمود

معاون

کلیم اللہ خان

جلد ۹ ——— شمارہ ۱-۲

اکتوبر، نومبر ۱۹۵۹ء

زاویئے

مستقل کالم :

برسبیلِ تذکرہ ——— مدیر

نقد و نظر ——— سیلانی

مقالات و مضامین :

کچھ جدید غزل کے بارے میں ——— جناب ریاض احمد ایم ۔ اے

عربی شاعری کی ایک جھلک ——— زیڈ ۔ ایچ قریشی

اقبال کا فقر ——— طارق سعید مرزا

عدم کی شاعری ——— سید مقبول حسین

یادِ رفتگان :

اِک چراغ اور بجھا .....! ——— ادارہ

..... ہم نہیں ہوں گے ——— مولانا عبدالمجید سالک مرحوم

طنز و مزاح :

ہوئے تم دوست جس کے ....." ——— ایم ۔ الیاس

ان سے ملئے ——— زرتشت منیر احمد

"خواب اور حقیقت ——— م ۔ ا ۔ فرخ

افکارِ عالیہ :

——— پروفیسر چودھری محمد علی ایم ۔ اے

——— پروفیسر نصیر احمد خان ایم ۔ ایس ۔ سی

——— پروفیسر چودھری محمد شریف خالد ایم ۔ اے

مینائے غزل :

——— خلیل رامپوری ——— سید الیاس بشیر احمد ———

——— محمد اقبال اختر ——— شیخ جمیل شاہین ———

——— سلیم اختر صدیقی ——— محمد ہادی مونس ———

پھنّاں دیاں پھلاں :

ٹالسٹائی دا نظریۂ فن ——— سمیع اللہ ایم ۔ اے

کافی ——— منظور احمد شاکر

غزل ——— لطف الرحمٰن محمود

"فرسٹ ایر"

چنانچہ فورتھ ایر اور سیکنڈ ایر کے پرانے وفادار سپاہی تو امتحان کی صعوبتیں سہ رہے تھے۔ اس لئے فرسٹ ایر اور تھرڈ ایر کی عام "بھرتی" دیر تک جاری رہی۔ ہر نئی چیز دیکھنے کی خواہش کس دل میں نہیں ہوتی؟ اب سیلانی کے پاس بھی مبلغ ایک عدد دل ـــــ دو عدد سالم آنکھیں اور ۲۰/۵ "نور" کی ایک عدد عینک ہے ـــــ اس سارے ساز و سامان کے ہوتے ہوئے فرسٹ ایر کے درشن نہ کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ـــــ ہر کالج میں فرسٹ ایر کی "دیکھ بھال" ہوتی ہے۔ مگر کئی "صوفی منش" بزرگ اس دیکھ بھال کو چھیڑ خانی سے تعبیر کرتے ہیں ـــــ یہ اُنکے اپنے ذوق کی بات ہے۔ ہمارے ذوق کی بات یہ ہے کہ نئے فوجیوں کو "خوش آمدید" کہنا چاہیئے ـــــ! اب بتایئے آخر اس میں کیا قباحت ہے؟ کہا جاتا ہے کہ اس "چھیڑ خانی" کی تان فورتھ ایر اور فرسٹ ایر وغیرہ کے درمیان "فرقہ وارانہ" فسادات پر جا کر ٹوٹتی ہے ـــ غالباً اسی وجہ سے فورتھ ایر اور سیکنڈ ایر کی رجمنٹوں کو ایجی ٹیشن ایکٹ مجریہ ستمبر ۱۹۳۱ء کے تحت نظر بند کر دیا گیا ـــــ گزشتہ کئی سال سے یہی قانون لاگو ہے لیکن ایسا کوئی نہیں کہ دم ہی مار سکے تاہم اتنی بات ضرور تھی کہ ان ایام میں قیدیوں کو تھوڑے تھوڑے وقت کے لئے "ضمانت" پر رہا کر دیا جاتا تھا مگر اس مرتبہ "ڈیٹ شیٹ" کے آرڈیننس مجریہ ۱۲ ستمبر ۱۹۵۹ء کے تحت ضمانت پر رہائی کی رعایت سلب کر لی گئی ہے ـــــ اور شاعرانہ "قید مسلسل" کی سزا سنائی گئی ـــ! ان تمام اسیروں کو سنٹرل جیل یعنی "کالج ہال" میں نظر بند رکھا گیا۔ گرمی کی شدت، قلمی مشقت، ذہنی کوفت اور عام ضعف کی وجہ سے اکثر اسیروں کی حالت نازک سے نازک تر ہو جاتی رہی۔ یہ خدا کا شکر ہے کہ "حادثہ بیک ہول" ہوتے ہوتے رہ گیا ہے ـــــ جب "فرسٹ ایر" کی موجودگی میں نقضِ امن کا خطرہ ٹل جانے کا یقین ہو گیا، تو عام قیدیوں کو رہا کر دیا گیا ـــــ سنٹرل جیل سے نکلنے کے بعد سیلانی کو یوں محسوس ہوا کہ گویا بیس پونڈ وزن گھٹ گیا ہے۔ تاہم دہائی کے فوراً بعد فرسٹ ایر کو ملاحظہ کیا گیا ـــــ ع

ہر گُل را بُوئے دیگر است!

کئی عزیز تو جمعہ جمعہ آٹھ دن کی پیدائش ہیں اور کئی ماشاءاللہ اتنے بوڑھے اور عمر رسیدہ ہیں کہ "ایمان" لانا پڑتا ہے کہ ہو نہ ہو ہمارے واجب الاحترام باوا کے پیچھے پیچھے جنت سے انہیں بزرگوں کو ارسال کیا گیا ہے ـــــ جو ارتقائی منازل طے کرنے کے بعد اب خیر سے فرسٹ ایر کے درجے کو پہنچے ہیں!!

اب خدا لگتی کہیئے ان ننھے منھے بچوں یا ان بوڑھے بزرگوں کو تنگ کرنے پر ہمارے حساس دل آمادہ ہو سکتے ہیں؟ جن بچوں کو آتا دیکھ کر ہم اپنے سانس روک لیتے ہیں کہ مبادا کہیں اُڑ نہ جائیں ـــ یا جن بزرگوں کے عصائے تقدس سے لرزاں ترساں ہیں ـــــ اُن سے چھیڑ خانی کیسے ہو سکتی ہے؟ الغرض فرسٹ ایر اور فورتھ ایر وغیرہ کے درمیان "طبقاتی" منافرت اور "فرقہ وارانہ" فسادات کا ہرگز ہرگز کوئی خطرہ نہ تھا ـــــ اگر دہم کی دوا ہماری بے مثال ڈسپنسری میں ہوتی یا جناب لقمانؑ کے پاس ہی ہوتی ـــــ پھر کچھ نہ کچھ مداوا تو ہو ہی جاتا ـــــ مگر ع

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

بہرحال یہ قانون مُفت میں حفظِ ماتقدم کے طور پر ہم پر لاگو کیا گیا ہے۔ اس کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ ویسے یہ کوئی نیا قانون نہیں کالج کے تاریخ دانوں کا اس پر اجماع ہے کہ ان خاص ایام میں ارباب اختیار کا یہی وطیرہ رہا ہے لیکن ہر دور میں "قیدیوں" سے

اچھا سلوک کیا جاتا رہا ہے۔ انہیں "ڈیٹ شیٹ" کی رُو سے مراعات حاصل رہی ہیں۔ مگر امسال بے چاروں سے ۱۸۵۷ء کے اسیروں کی مانند سلوک روا رکھا گیا ہے۔ سیلانی کی مظلومین کے حق میں یہی دعا ہے۔ ع

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

نئے قوانین

سیلانی کو جن چیزوں سے ہمیشہ نفرت رہی ہے ان میں "نوٹس بورڈ" بھی شامل ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شاید ہی ان پہ کوئی معقول بات چسپاں کی جاتی ہے ——— یہی وجہ ہے کہ سیلانی نے نوٹس وغیرہ پڑھنے کی تکلیف شاید ہی کبھی گوارا کی ہو ——— گزشتہ دنوں کچھ ایسے سنسنی خیز نوٹس چسپاں کئے گئے کہ خود بخود نظریں اُدھر اُٹھ گئی ہیں ——— تحریری طور پر سیلانی کی توجہ ان اعلانات کی طرف مبذول کروائی گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ یار لوگ تبصرہ چاہتے ہیں ——— لیجئے تبصرہ حاضر ہے:-

سٹاف روم ایکٹ:- واضح ہو کہ یہ حکم نامہ افسر بکارِ خاص جناب جنید ہاشمی صاحب کی طرف سے "نازل" ہوا ہے۔ اس کی رُو سے "عوام" یعنی طلبہ کو متنبہ کیا گیا ہے کہ خاص اجازت کے بغیر "سٹاف اسمبلی چیمبر" میں داخل ہونے والا "حوالۂ پولیس" کیا جائے گا ——— دفتر کے ایک ترجمان نے اس ضابطے کی وضاحت کرتے ہوئے کہا ہے کہ طلبہ اس حد تک بے تکلف ہو گئے تھے کہ سٹاف روم کی حیثیت خالہ جی کے باڑے کی سی ہو گئی تھی ——— اس کے علاوہ وہاں آمد و رفت اس قدر عام ہو گئی تھی کہ "سرکاری ٹریفک" کو بھی رُکنا پڑتا تھا ——— آمنّا و صدّقنا ——— لیکن سیلانی کا خیال ہے کہ اس قانون کا نفاذ ٹریفک کے حادثات کے پیشِ نظر نہیں، بلکہ وجہ دراصل اور ہے ——— اور وہ یہ کہ امتدادِ زمانہ کے طفیل "اراکین اسمبلی" اور "رعایا" کے مابین حجم اور جسامت کے اعتبار سے فرق روز بروز گھٹتا جا رہا تھا۔ اس امتیاز کے پیشِ نظر یہ ضابطہ جاری کرنا پڑا ہے۔ "رعایا" کا مفاد اسی میں ہے کہ اس حکم پر عمل پیرا ہو ورنہ داخلے کے "سیزن" میں "رُوٹ پرمٹ" یا "لائسنس" ملنے میں دشواریاں پیدا ہو جائیں گی ——— ہشیار باش !!

"قانونِ انسدادِ سمگلنگ":- یہ ضابطہ زون آف ٹس کے ایڈمنسٹریٹر محترم صوفی صاحب کی طرف سے بحوالہ پرنسپل صاحب جاری کیا گیا ہے۔ "ریاست ہائے متحدہ تعلیم الاسلام کالج" پہ جغرافیے کی دو کتابیں شاید لائبریری سے دستیاب ہو سکیں گی ——— تفصیل تو آپ وہاں ہی پڑھیں، مختصراً حدودِ اربعہ یہ ہے کہ شمال میں کوہ جلالیہ، مشرق میں "ریاست فضل عمر ریسرچ" ——— جنوب میں بحرِ جناب اور مغرب میں تعلیم الاسلام ہائی سکول کا وسیع و عریض ملک ہے۔ ملحقہ ملک میں دو ریاستیں "عزیز بُک شاپ" اور "مُون لائٹ بُک لینڈ" ہیں۔ اوّل الذکر نے تو تعلیم الاسلام ہائی سکول سے باقاعدہ الحاق کر لیا ہے مگر مؤخر الذکر نے خود مختار رہنے کو ترجیح دی ہے ——— گویا ایک لحاظ سے اس کی حیثیت وہی ہے جو بھارت میں "گوا" کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سیلانی ہمیشہ اس "ریاست" کو "گوا" کے نام سے موسوم کرتا ہے ——— آمدم برسرِ مطلب، اس قانون کا مقصد "سمگلنگ" کی روک تھام ہے۔ "قومی کرنسی" کے کالج سے باہر جانے کی شکایات گاہے گاہے محکمۂ کسٹم کو یوں تو طویل عرصے سے مل رہی تھیں ——— لیکن اب ہمسایہ ملک کی سرحدات پہ جھڑپیں ہوئی ہیں ——— نقضِ امن کے پیشِ نظر یہ قانون ہنگامی طور پہ نافذ کیا گیا ہے۔ اس کی رُو سے کالج کا کوئی طالب علم ہمسایہ ملک کی

حدود میں قدم رکھنے کا مجاز نہیں۔ اس حکم کی خلاف ورزی کرنے والے کو دو سال کے لئے "ملک بدر" کرنے سے پہلے مبلغ یکصد روپے جرمانہ وصول کیا جائے گا۔ پتہ چلا ہے کہ پیر صاحب "گوا تریف" نے تجارتی تعلقات بحال کرنے کے لئے متعلقہ حکام سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی ہے۔ ویسے کالج کے باشندوں کی سہولت اسی میں ہے کہ "تجارت" کی عام اجازت ہو ——

عام انتخابات

گزشتہ سے پیوستہ شمارے میں "ڈاکٹری رپورٹ" آپ نے ملاحظہ کر لی ہوگی کہ ہر سال —— یونین —— کی پیدائش اکتوبر میں ہوتی ہے اور ترقی کی منزلیں جلدی جلدی طے کرنے کے بعد اپنی سرگرمیوں کی وجہ سے نام پیدا کرتی ہے —— حتیٰ کہ فروری کے آخر میں زکام اور نزلے کی شکایت سے وفات پا جاتی ہے —— لیکن اس مرتبہ افواہ گرم تھی کہ پیدائش "ایٹمی نوعیت" کی ہوگی —— یعنی اچانک اور عجیب و غریب انداز سے، افواہ یہ تھی کہ پروفیسر نصیر احمد خان صاحب اپنے خصوصی اختیارات کو بروئے کار لا کر قومی اور ملی مفاد کے پیش نظر ریاست ہائے متحدہ تعلیم الاسلام کالج کی تمام سیاسی پارٹیوں کو خلاف قانون قرار دے دیا ہے۔ یونین کا کام چلانے کے لئے چند محنتی اور مخلص طلبہ نامزد کر دیئے جائیں گے —" سیلانی تو حرکت اور حرکت کے تسلسل کا قائل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس افواہ سے بہت قلق ہوا لیکن جب بعد میں آنے والے واقعات نے ثابت کر دیا کہ یہ افواہ بالکل بے بنیاد تھی —— تو اپنی جلد بازی اور عجلت پہ قلق "ہوا" —— یہ بات نہ جانے کتنی مدت تک ذہن میں چبھتا رہا!! کافی غور و خوض کے بعد یہ عقدہ اب وا ہوا کہ اس افواہ کے "مصنفین" کالج کے وہ ممبرانِ سیاست دان ہیں جو اپریل میں "ڈسٹنکشن کمیشن" کی "سکریننگ" سے بچ نہیں سکے —— فضل عمر ہاسٹل کا صوبہ بڑا مردم خیز ہے۔ جس پلڑے میں ہاسٹل بیٹھ جائے پھر یوں سمجھنا چاہئے کہ دوسرے پلڑے کے نیچے آنے کی توقع رکھنا عبث ہے۔ ہاسٹل کی تمام پارٹیاں ابوبکر صاحب کی پارٹی میں مدغم ہو گئیں اور ایک متحدہ محاذ بن گیا —— سیلانی اسی وقت بھانپ گیا تھا کہ یہی "الشوا فریقین پارٹی" ہی جیتے گی۔ اس "متحدہ محاذ" کو دیکھ کر بڑے بڑے سیاست دانوں کے پاؤں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔ ہوا کا رخ دیکھ کر سمیع صاحب تو پیچھے ہٹ گئے —— اور "اَن فٹ یونین" بن گئے۔ گو حالت بھی ان دنوں غیر ہو گئی ——

انتخابات سے قبل خوب گہما گہمی رہی۔ انتخابی مہمات کا سلسلہ چل نکلا! "تہذیب گداگروں" نے ہاتھوں میں کشکول تھام لئے —— ووٹروں کی گردنیں تن گئیں۔ ووٹروں اور امیدواروں کے مابین گمشدہ کڑیاں باپ دادا کے عہد کے پرانے دوستانہ مراسم اور رشتہ داریوں کے انکشافات ہونے لگے —— ہائے اس زمین سے سیکھنے کی خاطر کیا کیا پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں ——!!

آخر کار وہ دن بھی آ گیا جس دن یونین کی قسمت کا فیصلہ ہونا تھا۔ اسی حال میں جہاں امتحان ایکٹ اسیر مرتے رہے تھے —! "وعظ" ہوا۔ تقریریں ہوئیں۔ "تعارف" کی بدعت کا اس دفعہ اعادہ نہیں ہوا۔ پہلے خیال کیا گیا کہ بیلٹ سسٹم مسدود رہے گا۔ چنانچہ خاص بکس بنوائے گئے —— الیکشن کمشنر محترم خان صاحب نے مبلغ دو عدد پولنگ افسروں کے تقرر کا اعلان کیا۔ اور بیشتر اس کے کہ یہ افسران اپنے عہدوں کا چارج لیتے۔ یہ سکیم ہی رد کر دی گئی اور وہ بکس غائب کر دیئے گئے۔ سادہ طریقے سے انتخابات ہوئے اور ابوبکر صاحب کی الشوا فریقین پارٹی جیت گئی —— منتخب نمائندوں پر تبصرے کے حقوق سیلانی کسی "آڑے وقت" کے لئے محفوظ رکھتا ہے۔ مختصراً یوں سمجھ لیجئے کہ —— ٹائٹل پیج کے علاوہ کتابت، طباعت اور

کاغذ گوارا ہے۔"

عام انتخابات کے بعد کابینہ مرتب ہوئی۔ اور پھر کابینہ کی "تاجپوشی" کی رسم بڑے تزک و احتشام سے منعقد ہوئی۔ کچھ حرکت میں برکت ہو رہی ہے۔ یونین آفس میں کچھ جان ڈالی جا رہی ہے۔ نئی چق آویزاں ہو چکی ہے۔ زرق برق پردوں کا اہتمام ہو رہا ہے۔ الماریوں کے ٹوٹے ہوئے شیشے تبدیل کئے جا رہے ہیں۔ جمع شدہ ٹرافیوں کے کھرنڈ اتارے جا رہے ہیں ـــــ بہرحال "اصلاحات" کی طرف توجہ ہے۔ ایک آدھ اردو مباحثہ بھی ہوا ہے لیکن سیلانی واشگاف الفاظ میں کہے دیتا ہے کہ مباحثے کا معیار نہایت پست اور عام انتظام ناقص تھا ـــــ اگر سارا زور صرف اور صرف یونین آفس کی آرائش و زیبائش پر صرف ہوتا رہا اور اس طرف توجہ مرتکز نہ کی گئی تو پھر ان مباحثوں کا خدا حافظ ـــــ سیلانی کو ڈر ہے کہ درخشندہ روایات کا طلسم پاش پاش ہو جائے گا اور پرانی زنگ آلود ٹرافیاں "پوجا پاٹ" کے لئے رہ جائیں گی ـــــ!! خدا کرے یہ دن ہم کبھی نہ دیکھیں !!

~~~

یونین کے انتخابات کے بعد دیگر "بنیادی جمہوریتوں" کی بحالی شروع ہو گئی۔ مجلسِ ارشاد یعنی "مجلسِ دستور ساز" ـــــ کا انتخاب بھی ہو گیا۔ "ڈسٹرکٹ بورڈوں" یعنی مختلف سوسائٹیوں کے انتخابات ہو گئے ہیں لیکن "کارپوریشن" یعنی ہاسٹل اور "پنچایتوں" یعنی ٹیوٹوریل گروپوں کے انتخابات ہونے والے ہیں ـــــ سائنس سوسائٹی چونکہ یونین کے بعد سب سے زیادہ اہمیت کی حامل ہوتی ہے اسلئے اس پر کچھ تبصرہ چاہیئے۔ محترم خان صاحب اللہ کے فضل سے ناظم امتحانات بھی ہیں، سائنس سوسائٹی کے صدر بھی۔ اب محترم خان صاحب بڑے قانونی آدمی ہیں۔ نئی نئی باتیں ہر وقت سوجھتی رہتی ہیں۔ چنانچہ سائنس سوسائٹی کے انتخابات بھی بڑی جدت سے ہوئے۔ اچھی خاصی گرمی پیدا ہو گئی۔ یہ انتخابات بھی حال ہی میں ہوئے۔ مباحثوں کے موسم میں جو گیلریاں مستورات کو عطا ہوتی ہیں وہ آرٹس کے طلبہ کو بخشی گئیں ـــــ!

اُمیدواروں کا حال ذرا سُن لیجئے۔ پہلے تو یہ افواہ اڑی کہ فورتھ ایئر والے بھٹہ صاحب کی نیت ٹھیک نہیں لیکن اللہ میاں کا شکر ہے کہ انہیں فوراً "ہدایت" نصیب ہو گئی۔ نثار صاحب ایشیو افریقن پارٹی کے بھروسے پر کھڑے ہو گئے۔ متحدہ محاذ کا ٹکٹ کول اور عصا انہیں "وراثت" میں ملا ـــــ ادریس صاحب اچھے بھلے بیٹھے ہوئے تھے مگر یار لوگوں نے محض اسلئے انہیں کھڑا ہونے کی تکلیف دی کہ ان کی شکل سائنسدانوں سے ملتی جلتی ہے اور امین صاحب نے دلیل یہ دی کہ "کثرتِ مطالعہ سے بلند پایہ سائنسدانوں کی طرح سر کے بال اڑ چکے ہیں"!! اسی طرح سیکنڈ ایئر اور فرسٹ ایئر نے دیکھا دیکھی الیکشن کا ذائقہ چکھنے کے لئے کئی سائنسدان "اُگ" آئے۔ تھرڈ ایئر کلاس نے معقول امیدوار بھیجے۔

انتخابی مہمات تیز رہیں لیکن ہمارے ادریس صاحب اللہ لوک آدمی ہیں۔ اُن کی "بے نیازی" دیکھ کر انہیں کھڑا کرنے والوں کو کچھ فکر ہوئی۔ چنانچہ حامیوں کے دستخط کروانے کا سلسلہ شروع ہوا۔ فرسٹ ایئر کے ایک دو طلبہ نے دستخط کئے۔ ادریس صاحب پھر لمبی تان کر سو رہے۔ شاید یہ سوچ کر کہ یہ دو دو دستخط دن دونی رات چوگنی ترقی کریں گے ـــــ آپ کے سلوک سے رفقاء خاصے پریشان رہے۔ اس کے برعکس نثار صاحب پہ سارا ہاسٹل نثار۔ اور پھر ابوبکر صاحب دھوپ میں اور چاندنی میں سائے کی طرح ساتھ ساتھ ـــــ آرٹس کے طلبہ ہیں کہ نثار صاحب کے لئے دوڑ دھوپ کر رہے ہیں ـــــ آخر کار آخری وقت آ گیا۔ تقریریں
~~~

ہوئیں - ادریس صاحب نے بڑی رقت سے تقریر کی - حالانکہ وہاں ہائیڈروجن گیس کے دھماکوں کی ضرورت تھی - اس کے برعکس نثار صاحب کا "ٹمپریچر" بہت زیادہ بلند تھا - ووٹنگ ہوئی - نثار صاحب کے تو بارہ ہوگئے ! اسی طرح سلیم صاحب اور حمید صاحب بھی منتخب ہوگئے - جو امیدوار رہ گئے انہیں تالیفِ قلوب کی نیت سے کچھ عہدے دیئے جارہے ہیں ! ادریس صاحب کو کلاس کی نمائندگی ملتی ہے مگر آپ قبول کرنے پر آمادہ نہیں ----- صدارت تو گئی "بے نیازی" سے اور اب نمائندگی کا بیڑہ "خودی" غرق کر رہی ہے - اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ بے چاری فورتھ ایئر کیمسٹری ----- دو تین سال سے "یتیمی" کی صعوبتیں سہنے کے لئے معرضِ وجود میں آتی ہے !! - ادریس صاحب کو سیلانی کا مخلصانہ مشورہ یہی ہے کہ وہ کبھی پولیٹکس کے پتے سونگھ کر اس مسئلہ پر سنجیدگی سے غور کریں - اور نثار صاحب کو یہ نصیحت ہے کہ وہ اہلِ کیمیا سے نیک سلوک کریں اور "یتامیٰ" کی آہوں سے ڈریں - کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ "یتیمی" اگلے سال ریاضی کی طرف منتقل ہو جائے !

اَدبی محفلیں

اب خیر سے کالج میں نصابِ تعلیم سے وابستہ مصروفیتوں سے ہٹ کر عام علمی و ادبی سرگرمیوں کا دَور شروع ہو چکا ہے ! ابتداء تو مجلسِ ارشاد نے کی ہے اب مجلسِ اُردو نے اُوپر تلے دو ادبی محفلیں برپا کی ہیں ! بھلا ہو جناب خالد صاحب کا کہ اِدھر اُدھر سے ماہرینِ فن کو منا لاتے ہیں ! پہلی مجلس کے انعقاد کا اعلان بڑے دھڑلے سے ہوا - اخباروں تک نوبت گئی - اعلان پڑھتے ہی ایک نئی زندگی رگ و ریشہ میں سرایت کر گئی ----- مقررہ وقت آیا ----- اور گزر گیا - انتظار کی ابتداء ہوئی ----- شاعرانہ "طوالت" طاری ہوا چاہتی تھی کہ مجلس اُردو کے کسی پردھان نے سیلانی کو بڑی مسرت سے یہ "مژدہ" سنایا کہ آج کچھ نہیں ہوگا - کیونکہ مہمان نہیں آسکے ----- " اس بجلی کے گرتے ہی امید دل کے تنکے خاک ہوگئے ----- اور سیلانی اس خاک کو وہیں ہال میں پھینک کر مایوسی کی حالت میں گھر لوٹا - بعد میں پتہ چلا کہ مجلس ہوئی اور خوب ہوئی - مقالے پڑھے گئے اور شعراء نے کلام سُنا کر محفل کو گرما دیا - "ثوابِ دارین" سے اس طرح محرومی پر سیلانی اب تک دانت پیس رہا ہے - پردھان جی اگر سیلانی سے معافی نہ مانگتے تو پھر ان کے سر کا خدا ہی حافظ تھا ----- بہرحال اس مجلس کے متعلق کچھ عرض نہیں کر سکتا ----- جعفری صاحب کے اشعار کو طلبہ ابتک گنگنا رہے ہیں -

دوسری محفل کے انعقاد کا اعلان پرانے زخموں کے لئے سکون آفریں مرہم ثابت ہُوا - "سابقون الاولون" کا مقام حاصل کرنے کے لئے سب سے پہلے ہال میں جا گھسے -

اِس محفل کے رُوحِ رواں ڈاکٹر عبادت بریلوی، حبیب اشعر اور محسن احسن تعلیم تھے - ڈاکٹر صاحب موصوف مشہور نقاد ہیں - اِس کالم میں کئی بار آپ کا ذکر ہو چکا ہے - آپ نے جدید شاعر اور جدید شاعری کی ہیئت کے تجربات پر "مقالہ" پڑھا - پروگرام کے مطابق پڑھنا تو مقالہ ہی تھا مگر تشریح و تفسیر نے ایک مبسوط لیکچر کی شکل اختیار کر لی ----- اس تقریر کے علاوہ "تمہید" بھی تھی ----- یوں سمجھئے کہ تمہید بھی ایک مقالہ تھی اور مقالہ تو بہرحال مقالہ ہی تھا - آپ نے شاعری میں جدت کی ابتداء سے لیکر موجودہ "انحطاطی" دور تک تمام حالات، واقعات اور ادبی انقلابات پر روشنی ڈالی - اِس سلسلہ میں "انجمن پنجاب" کی ذہنی اور فکری تحریک کا بھی ذکر آگیا ----- میر سے لے کر میراجی تک کے اسالیب پر بھی سیر حاصل تبصرہ کیا - آپ نے خصوصیت سے اُن اثرات کا جائزہ لیا جو جنگ عظیم ثانی

کے بعد اُردو شاعری اِن سے متاثر ہوئی ——

قیامِ پاکستان کے بعد شاعروں کی "افراط" کی شکایت عام ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے لاہور میں ہونے والے شاعروں میں "اکثریت" کی "نیم دلی" کا ذکر بھی ضمناً کر دیا۔ لطیفوں اور چٹکلوں سے قہقہے بکھیرتے رہے۔ سوالات کا سلسلہ شروع ہوا۔ خدا کا شکر ہے کہ اساتذہ و طلبہ نے "معقول" سوالات ہی پوچھے۔ سوالات کے بلند معیار کا ڈاکٹر صاحب پر خاص اثر تھا۔ سنجیدگی اور وقار ہماری محفلوں کا طرۂ امتیاز ہوتا ہے۔ اور یہ روایت برقرار ہی ہے۔ متوقع ساعتوں کی فہرست پوری نہ ہو سکی۔ امید ہے "آئندہ" کی تلافی مستقبل قریب میں ہو پائے گی۔

فاضلانہ لیکچر کے بعد حبیب اشعر صاحب اور کلیم صاحب نے اپنے بلند پایہ کلام سے نوازا۔ جناب حبیب اشعر مسیح الملک حکیم اجمل خاں صاحب کے نواسے ہیں۔ اپنے تیر بہدف نسخوں سے "جسمانی امراض" کا علاج کرتے ہیں اور اپنے تیر بہدف اشعار سے فن کے مریضوں کو روحانی تسکین بہم پہنچاتے ہیں ——

ذرا ملاحظہ ہو ؎

طور بے طور ہوئے جاتے ہیں — اب وہ کچھ اور ہوئے جاتے ہیں
چھلکی پڑتی ہے نگاہِ ساقی — دور پہ دور ہوئے جاتے ہیں
تو نہ گھبرا کہ ترے دیوانے — خوگرِ جور ہوئے جاتے ہیں
عشق کے مسئلہ ہائے سادہ — قابلِ غور ہوئے جاتے ہیں

مجھ کو ڈر ہے کہیں رندوں کو نہ بدظن کر دے
تری محفل کا یہ فرسودہ نظام اے ساقی!
وہ بھی پتھر کے زمانوں کی طرح جینے لگے ہیں
جن کو حاصل ہے ترا قربِ دوام اے ساقی!

جناب کلیم صاحب چائے پان کے رسیا نظر آتے ہیں۔ "نوائے وقت" کے اسسٹنٹ ایڈیٹر ہیں۔ آپ کے ہر شعر پر سامعین جھوم اٹھتے۔ کچھ شعر یاد رہے ہیں۔ سنیئے اور سر دھنیئے ؎

معلوم نہیں یہ غمِ دل ہے کہ غمِ زیست
دامن مرا کھینچا کسی مبہم سے اثر نے

پھر تیرہ شبی سے ہے سحر دستِ گریباں
پھر ظلمتِ غم تاب لگی جیسے نکھرنے

بیتے ہوئے لمحوں سے مجھے کس نے صدا دی
لبیک کہا کس کو مرے دیدۂ تر نے

بہت تلخ ہیں زندگی کے فسانے
مرے خواب ہیں پھر بھی کتنے سہانے
ستاروں کے آگے بہت کچھ پڑا تھا
زمیں پر بھی جینے کے ہوں کچھ بہانے
سہارا نہ دیتی اگر موجِ طوفاں
ڈبو ہی دیا تھا ہمیں ناخدا نے
گری اور گرتی رہی برقِ سوزاں
بنے اور بنتے رہے آشیانے

منجملۂ افکارِ جہاں ہے غمِ دل بھی
کہتا ہے اسے کون حریفِ غمِ دوراں

اِک چراغ اَور بُجھا اَور بڑھی تاریکی!

حال ہی میں مولانا عبدالمجید صاحب سالکؔ ہم سے جُدا ہوئے ہیں۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔ ہر مخلص اور ہمدرد ادیب قوم کی متاعِ عزیز ہوتا ہے ــــــ ایک ایسا ستارہ جس کی روشنی میں قومی کارواں منزل کی طرف بڑھتا ہے ــــــ سالکؔ بھی ایک ایسا ہی ستارہ تھا، جو صحافت اور ادب کے آسمان پر پوری تابانی سے جگمگاتا رہا!! یہی وجہ ہے کہ مولانا کی وفات کا صدمہ ملک کے گوشے گوشے میں محسوس کیا گیا ہے۔ مرحوم کے فن اور تحقیق و تدقیق کے جذبے سے قوم کے علمی اور ادبی سرمایہ میں گرانقدر اضافہ ہوا ہے۔ مرحوم کی آخری تصنیف ــــــ "مسلم ثقافت ہندوستان میں" ــــــ ایشیا کی بہترین کتاب سمجھی گئی ہے اور یونیسکو نے مصنف کو انعام کا مستحق قرار دیا ہے۔ یہ ایک ایسا اعزاز ہے جس پر ملک و قوم فخر کر سکتے ہیں ــــــ

مولانا مرحوم یوں تو بہت سی خوبیوں کے مالک تھے لیکن سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ ادبی، علمی بلکہ ہر شعبۂ زندگی میں نوجوانوں کی رہنمائی اور حوصلہ افزائی کرنے کا مقدس جذبہ آپ کے حساس دل میں پوری طرح موجزن تھا ــــــ

مولانا مرحوم کئی مرتبہ ربوہ آئے۔ آخری بار ۱۹۵۵ء میں تعلیم الاسلام کالج کے ایک مشاعرے کی صدارت کے لئے تشریف لائے تھے۔ اس وقت طلبہ نے مرحوم کی پُرکشش شخصیت کا قریب سے جائزہ لیا اور انہیں خوش خُلقی، معنی آفرینی، جدت طرازی اور بذلہ سنجی کا مجسمہ پایا۔ ان کا متبسم چہرہ خلوص، شفقت اور بے لوث محبت کا آئینہ دار تھا ــــــ!

موت نے قوم سے ایک بہت بڑا ادیب، صُبح گو مصنف، معروف طناز، مشہور صحافی اور عظیم شاعر چھین لیا ہے۔ مولانا سالکؔ مرحوم کی وفات سے مُلک کے علمی، ادبی اور صحافتی حلقوں میں ایک ایسا خلا پیدا ہو گیا ہے جس کے پُر ہونے کی توقع نہیں ــــــ

ادارہ المنار اس عظیم قومی صدمے پر قوم کے صدمے میں پُوری طرح شریک ہے۔ دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم پر رحم فرمائے اور لواحقین کو صبرِ جمیل بخشے۔

(ادارہ)

سنوارے جائیں گیسوئے دوراں ہم نہیں ہوں گے!

—— یہ وہ تاریخی نظم ہے جسے مولانا سالک مرحوم نے تعلیم الاسلام کالج کے ایک عظیم الشان مشاعرے (منعقدہ ۱۹۵۵ء) میں کرسیٔ صدارت پر جلوہ افروز ہو کر، تحسین و آفرین کے غلغلوں میں، اپنے مخصوص انداز سے پڑھا —— (ادارہ)

چراغِ زندگی ہوگا فروزاں ہم نہیں ہوں گے
چمن میں آئیگی فصلِ بہاراں ہم نہیں ہوں گے

جوانو۔ اب تمہارے ہاتھ میں تقدیرِ عالم ہے
تمہیں ہوگے فروغِ بزمِ امکاں ہم نہیں ہوں گے

جئیں گے جو وہ دیکھیں گے بہاریں زُلفِ جاناں کی
سنوارے جائینگے گیسوئے دوراں ہم نہیں ہوں گے

ہمارے ڈُوبنے کے بعد اُبھریں گے نئے تارے
جبینِ دہر پہ چھٹکے گی افشاں ہم نہیں ہوں گے

نہ تھا اپنی ہی قسمت میں طلوعِ مہر کا جلوہ
سحر ہو جائے گی شامِ غریباں ہم نہیں ہوں گے

اگر ماضی منوّر تھا کبھی تو ہم نہ تھے حاضر
جو مستقبل کبھی ہوگا درخشاں ہم نہیں ہوں گے

ہمارے دَور میں ڈالیں خرد نے اُلجھنیں لاکھوں
جنوں کی مشکلیں جب ہونگی آساں ہم نہیں ہوں گے

کہیں ہم کو دکھا دو اک کِرن ہی ٹمٹماتی سی!
کہ جس دن جگمگائے گا شبستاں ہم نہیں ہوں گے

ہمارے بعد ہی خونِ شہیداں رنگ لائے گا
یہی سُرخی بنے گی زیبِ عنواں ہم نہیں ہوں گے

○

پروفیسر چوہدری محمد علی
ایم۔اے

○

حادثہ وہ جو اَب کے سال ہُوا
حسبِ اُمّید۔ حسبِ حال ہُوا

سُن کے کہنے لگے مرا احوال
ہم کو صدمہ ہُوا ۔ ملال ہُوا

ایک تجھ سے وفا کی تھی اُمید
تُو بھی لوگوں کا ہم خیال ہُوا

تیرے بے وجہ مسکرانے پر
ہم کو کیا کیا نہ احتمال ہُوا

دلِ خانہ خراب کے ہاتھوں
کیا بتاؤں جو میرا حال ہُوا

جس سے پُوچھو وہی فرشتہ ہے
آدمی کوئی خال خال ہُوا

ایک بندہ۔ ہزار بندہ نواز
بندگی کیا ہوئی وبال ہُوا

کچھ تو دل کو قرار آئے گا،
تُو ہُوا یا ترا خیال ہُوا

عشق کی دار و گیر میں مضطرؔ
ایک دل تھا جو پائمال ہُوا

پروفیسر نصیر احمد خان
ایم۔ ایس۔ سی

محبت کا سارا جہاں آپ کا ہے
زمیں آپ کی آسماں آپ کا ہے

شب و روز کی گردشیں اللہ اللہ
زماں آپ کا ہے مکاں آپ کا ہے

تماشائے محمل بیابان بیابان
جرس آپ کی کارواں آپ کا ہے

یہ آنسو یہ تارے، یہ آہیں یہ بادل
شرر آپ کے ہیں دھواں آپ کا ہے

تیرے عشق سے سر میں سودائے سجدہ
جبیں آپ کی آستاں آپ کا ہے

ہے سینے میں دل، دل میں موجِ محبت
یہ جذبہ نہاں در نہاں آپ کا ہے

فقط خاک و خون بزمِ ہستی میں اپنے
عَلَم آپ کا ہے نشاں آپ کا ہے

میری زندگی بے حقیقت فسانہ
فسانے کا رنگیں بیاں آپ کا ہے

نصیرِ حزیں گر نہیں ہے تو کیا ہے
یہ سب حلقۂ عاشقاں آپ کا ہے

پروفیسر چوہدری محمد شریف خالد
ایم۔اے

○

محبت کے نغمے ہیں پُرسوز سارے

اسی سوز سے ہیں یہ دل میں شرارے

سدا جلتے رہنا ہی ہے کارِ طالب

محبت میں جیتے وہی جو کہ ہارے

ہیں طوفان و گرداب و ظلمت مسلّط

مری کشتیٔ دل لگی نہ کنارے

جو ہوتا انہیں وصل تیرا میسّر

تو کیوں لوگ پھرتے یونہی مارے مارے

شہیدِ محبّت نہیں وہ پتنگا

جو سوزش کی لذّت نہ ہرگز سہارے

خوشا گر مرے غمکدہ میں وہ آئیں

تو دُنیا سے خالدؔ خوشی سے سدھارے

مقالات

جناب ریاض احمد
ایم۔اے

کچھ جدید غزل کے بارے میں

یہ مقالہ بزمِ اُردو تعلیم الاسلام کالج کے ایک اجلاس میں پڑھا گیا۔

ادبی روایت ایک معاشرے کی مخصوص ذہنی افتاد اس کے اسلوبِ فکر، احساس، قدر اور مجموعی جذباتی ردِ عمل تشکیل پاتی ہے۔ غزل جو ایک ہزار سال تک ہمارے ہاں مروّج و مقبول رہی ہے۔ یوں تو ہو نہیں سکتا کہ ہمارے مزاج کی افتاد کے لئے بالکل اجنبی ہو اور گزشتہ سالوں میں جب یہ نظم کے مقابلے میں رد دی گئی تھی۔ تو ظاہر ہے کہ مغربی علوم و فنون کے بیاں سادہ مطالعے نے ہمیں بعض نئی راہیں سجھائی تھیں جن پر غزل نہ چل سکتی تھی لیکن یہ نئے انداز اور نئے اسلوب اس وقت تک نہ تو اپنے اثر و نفوذ کے اعتبار سے پوری قوم کو مسخر کر سکتے ہیں اور نہ اس محدود مغرب آشنا حلقے کی فطرتِ ثانیہ بن سکتے ہیں جو مغربی علوم سے واقف ہے۔ یہ Reorientation کی ابتدائی اور شعوری کوشش تھی، جو سیاسی اعتبار سے ایک انفعالی قسم کا ردِ عمل تھا۔ آزادی کے بعد اس انفعالی ردِ عمل کا باقی رہنا ممکن نہ تھا لیکن دوسری طرف ذہن ان نئی راہوں سے ایک نسبتاً گہری یگانگت محسوس کرنے لگے ہیں چنانچہ سلبی اور انفعالی ردِ عمل کی بجائے ایک مثبت اور فعال ردِ عمل بروئے کار آیا تو ہمارے لئے ممکن ہو گیا کہ ہم گذشتہ کے برعکس اپنی چال بھولے بغیر ہنس کی چال چل سکیں۔ یہاں پہنچ کر غزل نے ایک نیا رنگ اختیار کیا۔

یہ نیا رنگ کیا تھا؟ یقیناً ایک الجھا ہوا سوال ہے۔ اس کے جواب کے لئے پہلے ضروری ہے کہ غزل کی پرانی روایت کو سمجھا جائے۔ غزل کی ابتدائی تعریف یوں کی گئی تھی "ذکرِ زناں و ذکرِ عشقِ ایشاں"۔ اس سے بیشتر لوگوں کو یہ سوجھی کہ غزل صرف حسن و عشق کی انفرادی واردات کے لئے مخصوص ہے لیکن جیسا کہ حمید احمد خان نے کہا ہے غزل کے دامن میں بہت جلد ایسے مضمون داخل ہو گئے جو فکر و احساس کی کسی خاص کیفیت کے باعث حسن و عشق سے متعلق تھے۔ غزل گو، بقول ڈاکٹر یوسف حسین خان "احساسِ جمال کو حیات و کائنات کے سمجھنے کے لئے بطور قدر استعمال کرتا ہے"۔ موضوع سے ہٹ کر غزل کا اپنا ایک مخصوص لہجہ بھی ہے۔ حمید احمد خان نے اسے بذلہ سنجی یا نکتہ آفرینی قرار دیا ہے۔ یوسف حسین خان کے نزدیک اس لہجے کا راز اجمال، ابہام اور رمز و کنایہ میں مضمر ہے۔ یہ وہی کیفیت ہے جس کا تقاضا ہم نثر کی تخلیقات مثلاً افسانہ میں بھی کرتے ہیں۔ عارف ہندی کا قول ہے ؎

رمز و ایما اس زمانے کے موافق بھی نہیں
اور آتا بھی نہیں مجھ کو سخن سازی کا فن

غزل کے اجمال کے متعلق اقبال کا یہ قول بھی قابلِ غور ہے: "ایرانی ذہن تفصیلات کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ اس کے بہترین حکیمانہ خیالات کا اظہار غزل کے منفرد اشعار میں ہوا ہے۔"
چنانچہ اصل بات یہ ہے کہ اچھے اور قدیم غزل گو احساسِ حقیقت سے بے بہرہ نہ تھے۔ البتہ ان کے احساس کا ایک مخصوص رجحان تھا اور ان کے بات کہنے کا ایک مخصوص ڈھنگ تھا۔ سوچ بچار غزل میں ہمیشہ سے شامل رہی ہے۔ یہ سوچ بچار ایک مخصوص نہج اور ایک مخصوص افتاد کی پابند ضرور تھی لیکن ہمہ گیری اور وسعت کے اعتبار سے محدود نہ تھی۔ ایک پرانے غزل گو کا شعر ہے ؎

در دلِ ما غمِ دنیا غمِ معشوق شود
بادہ گر خام بود پختہ کند شیشۂ ما

اس سے بھی پہلے عارفِ روم نے یہ کہا تھا ؎

خوشتر آں باشد کہ سرِ دلبراں
گفتہ آید در حدیثِ دیگراں

غالب نے بھی اس مضمون کو اردو میں پیش کیا ہے ؎

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر
مطلب ہے ناز و غمزہ ولے گفتگو میں کام
چلتا نہیں ہے دشنہ و خنجر کہے بغیر

یہ دوسری بات ہے کہ پرانے زمانے میں ہمارا احساسِ قدر اپنی بلندی پر پہنچ کر تصوف کا روپ دھار لیتا تھا اور غزل میں بہر طور مختلف فکری سطحوں پر وہی جذبِ عشق اور نظر کی بات دہرائی جاتی تھی۔

پھر غزل ہمیشہ ایک ہی رنگ میں نہیں کہی گئی۔ داخلیت و خارجیت، حقیقت اور سطحیت، معنویت اور لفظ پرستی، مختلف ادوار میں غزل کو کبھی بلندی اور کبھی پستی کی طرف دھکیلتے رہے ہیں۔ ابہام گوئی اور تازہ گوئی کی روایت کا خیال کیجئے۔ ایک شعر کہنے کے لئے ذہن کو کیا کچھ نہ کرنا پڑتا ہوگا۔ سوچ بچار تو بہرحال موجود تھی، سوچ بچار کے زاویئے بدلتے رہے۔

وہ روایت جس نے پتنگ بازوں، قلعی گروں اور ریوڑی بنانے والوں کو غزل گو بنا دیا کچھ خاص طور پر غزل کی روایت نہ تھی۔ غزل کی جگہ کوئی بھی صنفِ سخن ہوتی، اس کا یہی حال ہوتا۔ وہ جو ان لوگوں سے ذرا بلند تر سطح پر تھے، وہ انہی حالات میں معنی آفرینی کی طرف متوجہ ہوئے۔ لیکن تک بندی کیا قصیدے میں نہیں ہوئی اور نظم ــــ جدید نظم پر بھی تو تک بندوں کا تصرف رہا ہے۔

اردو میں جدید غزل کا بانی غالب کو قرار دیا جاتا ہے۔ اور غالب کو لوگوں نے فلسفی تک کہہ دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ سوچ بچار کا فقدان نہ تھا بلکہ سوچ بچار کی بہتات تھی جس کی طرف لوگوں نے اشارہ کرنا چاہا۔

اس کے بعد ایک بہت بڑا شاعر پیدا ہوا جس کی غزل اپنا جواب آپ تھی۔ میری مراد اقبال سے ہے۔ اور اقبال بھی فلسفی تھا روایتی فلسفی نہیں بلکہ فلسفہ میں مغربی یونیورسٹیوں سے گراں پایہ ڈگریاں حاصل کر چکا تھا۔ اقبال نے غزل کو ایک نئی معنوی وسعت سے آشنا کرایا لیکن غزل کے لہجے کو نہ بدلا۔ در اصل لہجے کی تبدیلی سے غزل غزل نہیں رہتی۔ سوال یہ ہے کہ سوچ بچار غزل میں اپنی صورت کیونکر بدل لیتی ہے کہ وہ سوچ بچار کے عام انداز سے مختلف نظر آنے لگتی ہے۔ حمید احمد خاں نے نظم کے مقابلے میں اسے عمومیت کے اعتبار سے ممیز کیا ہے۔ یوسف حسین خان کے نزدیک یہ فرق یوں پیدا ہوتا ہے کہ غزل میں مرکزی خیال خود شاعر

کی ذات ہوتی ہے۔ ادب میں عمومی طور پر خیال اور فکر کے مقابلے میں احساس اور جذبات مرکزی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہی بات غزل پر بھی صادق آتی ہے۔ اجمال اور رمز و ایما اس کے ساتھ کچھ اور تقاضے بڑھا دیتے ہیں اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک خاص فکری ردِ عمل بھی ایک جذباتی ردِ عمل نظر آنے لگتا ہے۔ ظاہر میں نظر دھوکا کھا جاتی ہے ؎

من و تو زاں غمِ شیریں ندانند
کہ اصلِ او ز افکارِ بلند است

خدا کی وحدانیت کا عقلی تصور جب جذباتی وفاداری کا تقاضا کرتا ہے تو بات ہم اوست یا ہم از وست تک پہنچ کر ہی نہیں رُک جاتی بلکہ اَنَا الحق کی سرحدوں کو جا چھوتی ہے مختصر یوں کہ غزل میں فکر یا منطق کا سہارا لے کر پیش نہیں کیا جاتا بلکہ ایک جذباتی ردِ عمل کی صورت میں پیش کیا جاتا ہے۔

جدید دور میں فکر و نظر نے مغربی علوم کے زیرِ اثر ایک تو تحلیلی انداز کا اثر قبول کیا ہے۔ دوسرے نظامِ زندگی میں مذہب کی حیثیت کسی حد تک بدل گئی ہے۔ اقبال کے فکری نظریے کی بنا اس چیز پر ہے کہ مذہب اور سیاست کی اقدار ایک ہی نظام کے تابع ہونی چاہئیں ؎

دوئی ملک و دیں کے لئے نامرادی
دوئی چشمِ تہذیب کی نابصیری

لیکن جب تک ایک غیر طاقت یہاں تھی یہ دوئی دُور نہ ہو سکتی تھی۔ جدید تہذیب کے مادی تصورات نے ذہن کو مذہبی تقدس کے احساسات سے کسی حد تک آزاد کر دیا تھا اور عملی طور پر مسلم لیگی ہو یا کانگرسی، اس کی سوچ کا انداز اور اس کا لائحۂ عمل ایک سیاسی رنگ اختیار کر لیتا تھا اس سیاسی رنگ نے جدید ادب کو بحیثیت مجموعی متاثر کیا ہے تحلیلی طریقۂ کار بظاہر غزل کی روایت کے خلاف تھا اور سیاست بھی غزل کا روایتی مضمون نہ تھا تاہم ان جدید ہمہ گیر رجحانات کی طرف سے غزل اور غزل گو کس طرح آنکھیں بند کر سکتے تھے۔ جہاں تک سیاست کا تعلق ہے اقبال نے اس سلسلے میں ہماری رہبری کی اور ہمیں یہ بتایا کہ وہی پرانے استعارے اور کنائے سیاسی ردِ عمل کو ظاہر کر سکتے ہیں۔ مثال دیکھئے ؎

نگاہِ فقر میں شانِ سکندری کیا ہے
خراج کی جو گدا ہو وہ قیصری کیا ہے
تیشے کی کوئی گردش تقدیر تو دیکھے۔
سیراب ہے پرویز جگر تشنہ ہے فرہاد

مادی اقدار کے احساس نے خود گزینی کے دائرے سے نکل کر خارجی اقدار کی طرف متوجہ کیا اور اب ہم حسن و عشق کی دنیا سے باہر کی زندگی کو بھی غزل میں پیش کرنے لگے۔ فراق کی غزل اس کی مثال ہے مذہبی، فلسفیانہ اور خالص سیاسی اقدار کے علاوہ زندگی کی عام اقدار، زندگی کی چھوٹی بڑی سب چیزوں سے شغف اور ان سے وابستہ جمالیاتی تحریکِ فراق کی غزل میں نمایاں طور پر موجود ہے۔ جدید غزل گوؤں کے انہی تاثرات نے روایتی عشق کی بعض حدود کو توڑنے کی جرأت دلائی۔ چند شعر دیکھئے ؎

اسی خیال سے دل کو تسلیاں دے لوں
کہ تیرے دم سے بھی ٹوٹا نہ زندگی کا فسوں

سناتی ہیں کوئی افسانہ تیری سہمگیں نظریں
ہوئی ہے مجھ سے گستاخانہ جرأت اس سے پہلے بھی

حفیظ ان کو نہ آئے گا یقین ترکِ محبت کا
کیا ہے بارہا ترکِ محبت اس سے پہلے بھی

~~~~~~

کوئی پروانوں کو سمجھاؤ کہ مرنے کے سوا
اور بھی چند مقاماتِ وفا ہوتے ہیں

~~~~~~

شہرت شبِ فراق ہے جی بھر کے سوئیے
ممکن ہے لوٹ کر نہ کبھی آئیں یہ سمے

~~~~~~

آشفتہ سرانِ حرم و دیر سے کہہ دو
آتی ہے سناٹوں کی کہیں دور سے آواز

~~~~~~

تھی تو یہی پہ آج سے پہلے ایسی حقیر فقیر نہ تھی
دل کی شرافت ذہن کی جدت اتنی بڑی تقصیر نہ تھی

~~~~~~

جہاں میں ہر چند معتبر ہے ردائے با تو قبائے خواجہ
فغاں کہ میرے لہو سے تر ہے ردائے با تو قبائے خواجہ

~~~~~~

غزل کی روایت سے ہٹ کر نئی بات کہنے کا یہ انداز ہے جس سے بعض اوقات یوں نظر آتا ہے کہ غزل کے دو مصرعے الٹ پلٹ کہہ دیئے گئے ہیں۔ شہرت کا یہ مطلع اسی انداز کا حامل ہے

اسی خیال سے دل کو تسلیاں دے لوں
کہ تیرے دم سے بھی ٹوٹا نہ زندگی کا فسوں

بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی کہ غمِ جاناں کے ہوتے ہوئے زندگی کا فسوں نہ ٹوٹے لیکن دراصل یہ بات اُن بے جوڑ لفظوں کے مجموعے سے پیدا نہیں ہوئی۔ بات کہنے کا ایک "بدلا ہوا" اسلوب اور موضوع کی ایک نئی تان اس مطلع کی خالق ہے۔

رہی ریزہ سرائی والی پرانی بات۔ تو جدید غزل نے یہاں بھی کروٹ بدلی ہے۔ کلیم الدین احمد نے تسلسل کے فقدان کے باعث ساری اردو شاعری کو درخورِ اعتنا نہیں جانا لیکن تسلسل ہے کیا؟ قدیم استاد بھی مسلسل غزل اور قطعہ بند کہا کرتے تھے کیا وہ تسلسل اس تقاضے کو پورا کرتا ہے جس کی طرف کلیم الدین احمد نے اشارہ کیا ہے۔ یقیناً نہیں۔ اس لحاظ سے قصیدے میں تسلسل موجود ہوتا ہے لیکن قصیدہ غزل سے بہتر صنفِ سخن نہیں۔ دراصل ایک خاص قسم کا پھیلاؤ۔ ایک سلسلے کی مختلف چیزوں کو احاطہ کرنے کی کوشش یا ایک ہی کیفیت کے مختلف اجزائے ترکیبی کو اجاگر کر دینا تسلسل کی شرط کو پورا نہیں کر سکتی۔ شعر میں تسلسل دراصل نام ہے ایک ایسی ارتقائی کیفیت کے استشہاد کا جو ایک تصور کے نقطہ آغاز سے اسکے مقامِ عروج تک ہماری رہبری کر سکے۔ جدید نظم میں یہ کیفیت بہت حد تک اجاگر ہو جاتی ہے لیکن غزل میں اس کا امکان نہیں۔ غزل کی وہ خصوصیت جسے حمید احمد خاں نے عمومیت کے نام سے تعبیر کیا ہے' البتہ جدید غزل میں اس امر کی گنجائش پیدا کر دیتی ہے۔ کہ ایک مخصوص جذباتی کیفیت کے ماتحت زندگی کے مختلف روپ جس طرح نظر آتے ہیں۔ انہیں ایک غزل کے دامن میں سمیٹ لیا جائے۔ جدید غزل میں تسلسل کی یہی کیفیت موجود ہے۔ اسی تسلسل کو قائم رکھنے کی خاطر یہ ہوا کہ لوگوں نے لمبی ردیفیں چھوڑ دیں ردیف اگر مختصر ہوا ور ایں انداز کہ اس میں معانی کے مختلف پہلو مضمر ہوں اور وہ اسی خاص کیفیت سے بھی ہم آہنگ ہو جو غزل کا موضوع ہے تو کچھ ایسی دقت پیدا نہیں ہوتی۔ مثلاً اصغر سلیم

کی ردیف "دولتِ بانو قبائے خواجہ" اپنی طوالت کے باوجود جمالی تصورات سے لیکر مادی اشتراکیت تک کے موضوعات کو اپنے دامن میں سمیٹ سکتی ہے۔ اس قسم کی ردیف غزل کے ظاہری حسن اور آہنگ کو بڑھاتی ہے۔ ذوالفقار بخاری کی مشہور ردیف "کہ ساقی رات گزرنے والی ہے" اسکی ایک مثال ہے جن غزلوں میں صرف قافیہ ہو ان میں ترنم کی کمی اکثر محسوس ہوتی ہے لیکن اسکے ساتھ یہ بھی ہے کہ ان جدید غزلوں میں جذباتی شدت اور اس کے پیدا کردہ تیز اور شوخ زیر و بم کے بجائے ایک دھیمے ترنم کا سوز اور سنجیدگی پیدا ہو جاتی ہے

کلیم الدین احمد نے غزل کو ایک نیم وحشی صنفِ سخن کا نام دیا تھا۔ تاثیر مرحوم کو اس میں جاگیردارانہ نظام کا پرتو نظر آتا تھا لیکن ایک چیز قابلِ غور ہے کہ وہ صنف جو اپنی تکنیک اور انفرادی لہجے کے لحاظ سے اتنی پختہ ہے کہ مکمل شعر پر ہی نہیں بلکہ منفرد مصرعوں پر بھی اسکی چھاپ اتنی گہری ہو کر اسے دوسری اصناف سے متمیز کیا جا سکے اسکے امکانات محدود فضا میں پہنچ کر یکلخت ختم تو نہیں ہو جانے چاہئیں۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ اسے ایسے فنکار میسر نہ آئیں جو اس کے نئے امکانات کو اجاگر کر سکیں۔ اور یہاں تو یہ بات بھی نہیں۔ اقبال اور فراق نے اور ان کے بعد بعض نوعمر فنکاروں نے غزل کے مستقبل کو بہت حد تک روشن کر دیا ہے۔

میر کا تتبع بھی دراصل اسی سلسلے کی ایک چیز ہے۔ یہ تتبع میر کے مخصوص لغت (Diction) کی نقالی کا نام نہیں ہے۔ اور نہ یہ انکے مضامین کے اعادے کا نام ہے۔ یہ تتبع میر کی ذہنی افتاد، جذباتی ردِعمل، اسکی آواز اور لہجے کی پہچان سے پیدا ہوا ہے۔ اس کے ساتھ ہی میر کے تتبع میں لکھنے والوں خصوصاً مختار صدیقی کے ہاں ایک منفرد رنگ بھی تو نظر آتا ہے۔ جیسے دو شخص مل کر گا رہے ہوں۔ تو آواز کی یک آہنگی کے باوجود دو آوازوں کا احساس ہوتا رہتا ہے۔ مختار کی غزل پڑھتے وقت ہمیں اسی طرح محسوس ہوتا ہے کہ یہ آواز دو آوازوں سے مل کر بنی ہے۔ جس سے اس میں ایک نیا سوز و گداز پیدا ہو گیا ہے

گلیاں وہ ویران ہیں جن میں تیرا دیوانہ پھرتا تھا
اسکے بہانے دید کو تیری سارا زمانہ پھرتا تھا

ایک طرح سے یہ بھی غزل کی پختگی کی دلیل ہے کہ انفرادیت اور اجتماعیت یہاں ساتھ ساتھ چل سکتی ہیں۔ میر کی غزل کا رنگ ایک پختہ عمومیت بن چکا ہے۔ اس رنگ کی عمومیت کو مجروح کئے بغیر اس میں انفرادیت کا انعقاد ——— یہ بات شاید کسی اور صنفِ سخن میں ممکن نہ تھی۔

ہوتی نہ عام جہاں میں کبھی حکومتِ عشق
سبب یہ ہے کہ محبت زمانہ ساز نہیں

علاج آتشِ رومی کے سوز میں ہے ترا
تری خرد پہ ہے غالب فرنگیوں کا فسوں

احکام ترے حق ہیں مگر اپنے مفسر
تاویل سے قرآں کو بنا سکتے ہیں پاژند
(اقبال)

زبیدہ - ایچ - قریشی
آنرز سٹوڈنٹ (آرٹس)

عربی شاعری کی ایک جھلک

پسِ منظر

دُنیا کے تمام ادبوں کی ابتداء شاعری سے ہوتی۔ حِسّ اور ادراک پر شعر کا اثر مسلّمہ ہے انسان کو جذبات کا حِس ہوتا ہے وہ دماغ کو کام میں لاتا ہے اور پھر سوچتا ہے کہ جب تک قوتِ ادراک اور قوتِ متخیلہ باقی ہیں شعر کا وجود ختم نہ ہوگا۔ اسی وجہ سے ارتقائی تہذیبِ انسانی میں نظم جو مظہرِ جذبات ہے نثر پر مقدم ہے یعنی جب کوئی یاس انگیز نغمہ چھیڑتا ہے تو سامعین بلا اختیار آہ و غم سے چیخ اٹھتے ہیں اور شاعر جب طرب و نشاط کا گیت الاپتا ہے۔ تو سننے والے خرّم و شادماں ہو جاتے ہیں۔ عربوں کے ہاں جب تک فنِ تحریر ایجاد نہ ہوا تھا زمانہ جاہلیت کے شعراء سینکڑوں طویل قصائد اپنے دماغ میں محفوظ رکھ سکتے تھے۔ اور قوتِ حافظہ کی بنا پر سن سکتے تھے۔ اسکے برعکس نثر کے چند ٹکڑے بھی یاد رکھنا مشکل ہو جاتا ہے۔

ہر چیز ابتداء میں ناقص ہوتی ہے۔ وہ خامیوں سے بھری ہوتی ہے لیکن جوں جوں وہ ترقی کے مدارج طے کرتی ہے مکمل ہوتی چلی جاتی ہے۔ اس میں وسعت، پختگی اور اوج آجاتی ہے۔

عربی ادب کی ابتداء شاعری سے ہوئی

دُنیا کے دوسرے ادبوں کی طرح عربی ادب کی ابتداء بھی شاعری سے ہوئی۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کی ابتداء کب ہوئی؟ طفولیت میں اس کی صحت کیسی تھی؟ جن لوگوں نے اس کی تربیت کی ان کا پایۂ بزرگی کیا تھا؟ مزید برآں یہ کہ اس کا باوا آدم کون تھا؟ ان سوالات کے جوابات بذریعۂ اعتقاد لیے ہیں۔ اور کچھ وثوق سے نہیں کہا جا سکتا۔ شعراء کے کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ **امرؤ القیس** سے پہلے بیسیوں شعراء ایسے گزرے ہیں جن کا کلام زمانے کے دستِ تطاول نے خورد برد کر دیا اور وہ ہم تک نہیں پہنچ سکا۔ ناقدینِ فن نے اوّلیت کا تاج **مہلہل بن ربیعہ** کے سر پر رکھا ہے جس نے کلیب کے قتل کے بعد مرثیہ لکھا۔

بہرحال جو اشعار ہم تک پہنچے ہیں وہ وزن اور قافیے کے لحاظ سے درست، لفظی اور معنوی محاسن کے لحاظ سے بلند تر ہیں۔ اس دور کی شاعری تمام تر غنائی ہے اور اس صنف کے تحت غزل، فخریہ، مرثیہ، مدح و ذم اور وصف آجاتے ہیں۔ یوں نظر آتا ہے کہ عربوں کی محبوبہ شاعری جدتِ خیال اور ندرتِ الفاظ کے سانچے سے مزین آراستہ اور پیراستہ ([illegible]) کی طرح دفعتاً پیدا ہوگئی تھی جو عیوب سے پاک اور نقائص سے مبرا تھی۔

وصف نگاری - ندرتِ تشبیہ

اس وقت جبکہ شاعر کو فطرت کے ساتھ ہم آہنگی تھی۔

وہ حسنِ فطرت اور سادگی کا دلدادہ تھا۔ اسے جذبات کی شاعری میں فضول استعاروں اور دور از کار تشبیہوں کی بہت کم ضرورت پڑتی۔ وہ تمثیلوں کے پیچ اور محاوروں کی گل کاری میں الجھنا پسند نہ کرتا۔ اسکی آنکھ فطرت کی جن رنگینیوں کو دیکھتی اور اس کا دماغ جن حقائق کا احاطہ کرتا، یہ حقائق خارجی ہوں یا خیالی۔ انہیں وہ الفاظ کی زبان میں اس طرح بیان کرتا کہ ہر چیز کی تصویر اصل سے زیادہ دلکش، دلفریب اور دلکش نظر آنے لگتی۔

نابغہ ذُبیانی، جو نعمان بن منذر والی حیرہ کا درباری شاعر تھا۔ اس عہد کا ایک نگینہ ہے۔ نعمان کی بیوی متجردہ جو حسن وجمال میں لاثانی تھی، کہیں منہ پر نقاب ڈالے کھڑی تھی سامنے سے نابغہ آ گیا۔ اتفاق کی بات کہ ہوا نے شوخی کی، منہ پر سے نقاب گر پڑا۔ ادھر نقاب گرا اور چہرہ کھلا، ادھر شاعر شیریں بیان کی نظر تڑپ کر اس پر آئی۔ ملکہ شرمائی۔ ایک ہاتھ نقاب اٹھانے کے لئے جھکا تو دوسرا دستِ تاباں کی آڑ بن گیا۔ یہ منظر ایسا نہ تھا کہ شاعر کے دل کو نہ گدگداتا۔ شعور نے چٹکی لی۔ زبان سے شعر نکلا اور واقعہ کی تصویر یوں کھینچی ؎

سَقَطَ النصیفُ وَلَمْ تُرِدْ اِسقاطَہُ
فتناولتہُ واتَّقَتْنا بالیَدِ

"یعنی بے اختیاری میں جو اس کا نقاب گرا۔ تو ایک ہاتھ اسنے نقاب کو اٹھانے کے لئے بڑھایا اور دوسرے سے اپنا منہ ہم سے چھپا لیا"

مصورِ حقیقی نے جس بُتِ طناز کو صناعی کے قلم سے تمام ظاہری محاسن اور خوبیاں دیکر بنایا تھا، دیکھا شاعر نے اسکی ایک ادا کو اس طرح الفاظ کے آئینے میں ظاہر کیا کہ دیکھنے والا برابر دیکھنے کی خواہش رکھتا ہے۔ نابغہ نے متجردہ کے کتابی چہرہ، ستواں ناک یاقوتی لبوں اور چشم آہو کی طرف اشارہ تو نہیں کیا لیکن یہ خدوخال پڑھنے والے کے پیش نظر ضرور رہتے ہیں۔ زمانہ جاہلیت میں شاعر کسی کی بے جا مدح وستائش کو اپنے لئے ننگ و عار سمجھتا تھا۔ وہ شاعری کو جلبِ منفعت کا ذریعہ نہیں بنانا چاہتا تھا۔ توصیف کے وقت وہ صرف ان خصائص کا ذکر کرتا تھا جو ممدوح میں موجود ہوتے۔

زہیر بن ابی سُلمٰی ایک مقام پر کہتا ہے ؎

لو کنتَ مِن شیءٍ سوی بَشَرٍ
کنتَ المنوّرَ لیلۃَ البدرِ

چہرے کی تابناکی اور حسن کی شگفتگی کو بدرِ منیر سے تشبیہ دی ہے۔ کتنی مقبول نظر آتی ہے۔

امرؤ القیس جو اشعر الشعراء ہے، فضول لفاظی سے احتراز کرتا ہے اور اپنی محبوبہ کے اوصاف گنتے وقت دقیق تشبیہیں استعمال کرتا ہے۔ جو جدت اور ندرت کے علاوہ قرین قیاس ہیں۔ ایک مقام پر کہتا ہے ؎

تُضِیءُ الظلامَ بالعشیِّ کأنّہا
منارۃُ مُمْسیٰ راھبٍ مُتَبَتِّلِ

"وہ اپنے منور چہرہ سے شام کے وقت تاریکی کو روشن کر دیتی ہے۔ گویا وہ تارک الدنیا راہب کا چراغ ہے۔"

عمدہ تشبیہوں اور مقبول استعاروں کے علاوہ دورِ جاہلیت کا شاعر منظر نگاری میں بھی کمال رکھتا ہے۔ وہ فطرت کے دلفریب مناظر کو حقیقت بین آنکھ سے دیکھتا ہے اور اس انداز سے بیان کرتا ہے کہ پڑھنے والے محسوس کرتے ہیں کہ جو کچھ وہ کہہ رہا ہے یہ آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔

برسات کی رُت ہے گھنے بادل آسمان پر چھائے ہیں۔ کبھی کبھی بجلی چمک کر بادلوں کے پیچھے چھپ جاتی ہے۔ بادو باراں

کا طوفان ساتھ ہے۔ اشجار ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہے ہیں۔ اس تمام منظر کو امرؤ القیس دیکھتا ہے اور قلم کو جنبش میں لاتا ہے رشحاتِ قلم یہ ہیں ؎

۱۔ أَصاحِ ترىٰ برقاً أُريكَ وميضَهُ
كلَمْحِ اليَدَيْنِ في حُبَيٍّ مُكَلَّلِ

۲۔ يُضِيءُ سَنَاهُ أو مصابيحُ راهِبٍ
أَهانَ السَّلِيطَ بالذُّبالِ المُفَتَّلِ

ترجمہ: ۱۔ اے ندیم! کیا تو نہیں دیکھتا یہ بجلی جو میں تمہیں دکھا رہا ہوں، کہ صفت بادل میں یوں چمک اٹھتی ہے جیسے محمل میں سے دو ہاتھ جھلک جائیں۔

۲۔ یا یہ اس طرح چمک رہی ہے جیسے کہ راہب نے بہاڑ پر چراغاں کیا ہے اور بٹی ہوئی بتی کو دل کھول کر تیل دیا ہے۔

جذبات نگاری و مرثیہ گوئی

ظہورِ اسلام سے قبل جبکہ بدویانہ زندگی نے شعراء کو فطرت کے قریب رکھا تھا اور تکلف اور تصنع سے دور، وہ جذبات نگاری کے ایسے نمونے پیش کرتے ہیں جو بعد کی شاعری میں معقود نظر آتے ہیں۔ درد و غم کا جذبہ اور جذبات قوی تر، اس لئے لازمی تھا کہ مرثیہ کی ابتدا اسی دور سے ہی ہوتی۔ شاعر جب کبھی رشتہ دار کی ناگہانی موت کے سبب قسامِ ازل سے شاکی ہوتا تو وہ اپنے جذباتِ حزن و ملال اور رنج و غم کا اظہار ہر موقع پر کرتا، خود روتا اور دوسروں کو رلاتا۔ مجنونوں کا سا حال اس کے گلے میں لٹک رہا ہوتا۔ اس کے بال پریشان اور گرد آلود ہوتے۔ دامن چاک ہوتا اور سینہ کوبی اس کا شیوہ ہوتا۔ متمم بن نویرہ اور خنساء کے مرثیے ہمارے قلبی جذباتِ حزن و ملال کا صحیح مرقع ہیں۔

ایک اعرابیہ[1] کا بیٹا مر گیا۔ ماں کو صدمہ پہنچا۔ جذبہ آزار کا احساس اور یاس و نامرادی کا جذبہ مرثیہ بن کر زباں سے نکلا۔ الفاظ نہیں جگر کے ٹکڑے ہیں جو کٹ کٹ کر منہ سے نکل پڑتے ہیں۔ کہتی ہے ؎

مَن شاءَ بعدكَ فليَمُتْ
فعليكَ كُنتُ أُحاذِرُ
كُنتَ السَّوادَ لناظري
فعَمِيَ عليكَ النّاظِرُ
ليتَ المنازلَ والديا رَ
حفائرٌ و مقابرٌ
إنّي وغيري لا محالَةَ
حيثُ صِرتَ لصائرُ

یہ اشعار جذباتِ مادرانہ کا ہو بہو عکس ہیں۔ اولاد کو کون نورِ نظر نہیں جانتا۔ کونسی ماں اپنے بیٹے کی موت پر پچھاڑیں نہیں کھاتی اور دنیا اس کی آنکھوں میں تیرہ و تار نہیں ہو جاتی۔ جوش مصرعہ مصرعہ چھپتا اور دل کو لگتا ہوا ہے صرف اس لئے کہ ایک اندوہناک حقیقت کی تصویر ہے +

(ماخوذ از تمدنِ عرب)

---

[1] اعرابیہ کا اصلی نام برّہ بنت حُریث ہے۔ اس کا ایک اور مرثیہ ڈاکٹر اعظم حسین نے کتاب الاختیارین میں درج کیا ہے۔
(کتاب الاختیارین صفحہ ۷۰)

طارق سعید مرزا
تھرڈ ایر (آرٹس)

"اقبال کا فقر"

شاعرِ مشرق علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال کی نغمہ سرائی سے کون واقف نہیں؟ لیکن آپ کوئی رومانی قسم کے نغمہ سرا نہ تھے بلکہ آپ کی شاعری باقاعدہ موضوعات کی پابند، اخلاق آموز اور فلسفیانہ تھی۔

اسی لئے اپنے اس عقیدے میں کہ "شاعری زندگی کے تابع ہوتی ہے" انہوں نے ایک اور بات کا اضافہ کیا اور وہ کہتے ہیں کہ شاعری زندگی اور شخصیت کے تابع ہوتی ہے۔ مادہ پرستی میں تو یہ خطرہ ہے کہ شاعری جماعتی سیاست یا جامد نظریوں کا غلام بن کر رہ جاتی ہے۔ لیکن اقبال نے شخصیت پر زور دے کر اپنے آپ کو اس خطرہ سے بچا لیا۔ انہوں نے سماجی زندگی کی جو اقدار مقرر کی ہیں ان کا مرکز بھی شخصیت کا ہی مسئلہ ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ جو چیز خودی کو تقویت دے اور اُسے جاندار بنائے وہ سماجی اعتبار سے اچھی ہے۔

اور اقبال نے اسی لئے اپنے نظامِ اخلاق کی بنیاد شخصیت پر رکھی۔ یہ چیز انہیں کسی ایک فرقہ کے نظریات کا اسیر بنکر رہ جانے سے بچا لیتی ہے۔ اور یہ حقیقت ہے کہ اقبال سے پہلے اُردو شاعری کی کائنات غزل، ضمنی اکتسابات، قصائد اور مثنویات پر مشتمل تھی۔ اس میں یا تو حزن و یاس کے مرقعے ملتے ہیں یا سطحی لذت پرستی اور خوش باشی کے نمونے بقول فراق "ہماری شاعری کا بیشتر حصہ یا تو تفریح تھا یا ماتم"۔

اور اقبال سے پہلے کے شاعروں نے ہمیں یا تو رُلایا تھا یا ہمیں گزشتہ عظمت پر آنسو بہانا سکھایا تھا یا زندگی کے تاریک پہلوؤں کو پیش کرتے ہوئے زندگی سے گریز۔ انہوں نے ہمیں زندگی سے محبت کرنے اور اس کی رفعتوں کو چھو لینے کی بجائے زندگی سے نفرت اور اس سے فرار کی تعلیم دی تھی۔ انہوں نے ہمارے سامنے زندگی کی ایسی بھیانک تصویریں پیش کی تھیں کہ ہم نے انہیں دیکھ کر زندگی سے ڈرنا شروع کر دیا۔

لیکن اقبال اُردو زبان کا پہلا شاعر ہے جس نے ہم پر اسرارِ حیات منکشف کئے۔ جس نے انسانی عظمت کے رازہائے سربستہ کو افشا کیا۔ جس نے زندگی سے ڈرنا نہیں لڑنا سکھایا کر ہمیں جہد للبقاء پر آمادہ کیا۔ اس نے ہمیں یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ شاعر کا کام محض ماضی کے پُرعظمت افسانوں کو یاد کر کے آنسو بہانا یا زندگی کی ٹھوس اور تلخ حقیقتوں سے گھبرا کر راہِ فرار اختیار کرنا اور "رومانیت" میں پناہ لینا نہیں بلکہ نوعِ انسان کو ایک ایسا پیغام دینا ہے جو یقین و عمل کی قوتوں کو بروئے کار لا کر اسی دُنیا کو جنت میں بدل دے!

در حقیقت اقبال کا تمام فلسفۂ خودی اُن تمام عصری رجحانات کا شدید ردِ عمل ہے جو ہمیں انفعالیت و مجہولیت کی طرف لے جا رہے تھے۔ اور جن کی سرحدیں عیسائیوں کی رہبانیت، ہندوؤں کے تیاگ، بدھ مت کے ترکِ حیات و استیصالِ تمنا اور دورِ حاضر کے مُلّا و صوفی کے مروجہ تصوف سے ملتی تھیں۔

ان تمام مختلف مدرسہ ہائے خیال کی تعلیم و تلقین نے انسانی

عظمت کو بُری طرح کچل کر رکھ دیا تھا۔ اور انسان میں کچھ اس قسم کا شدید احساس کمتری پیدا کر کے رکھ دیا تھا۔ جس نے اس کی تمام عملی قوتوں کو موت کی نیند سلا دیا تھا۔

اقبال کا مقصد یہ ہے کہ انسان کو اس نیند سے بیدار کیا جائے۔ اقبال کی تمام شاعری کا محرک حقیقی صرف یہ ہے کہ انہوں نے اپنے ذہن میں انسان کا ایک بلند و برتر تصور قائم کیا۔ اور اس کا نام "مردِ مومن" رکھا جس کی نگاہ سے تقدیریں پلٹ جاتی ہیں۔ اس "مردِ مومن" کی صفات کی وضاحت انہوں نے مختلف عنوانات سے کی ہے کہیں مردِ مومن مسندِ عشق پر متمکن ہے اور کہیں مسندِ فقر پر۔

اور اقبال نے اسی فقر و درویشی کو اپنی شاعری کا پس منظر بنا کر جو کچھ کیا ہے اس کا محرک وہی جذبہ صادق تھا جو انسانی عظمت و برتری پر منتج ہو جاتا ہے۔ اقبال زندگی کو عظمت کا حامل دیکھنا چاہتا ہے اور وہ اس بات کا خواہشمند ہے کہ انسان کو اپنی قدر و قیمت کا احساس ہو جائے اسکے سینے میں یہ خیال نہ کسی طرح کھٹکتا تھا کہ "کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا"

اور اقبال نے فقر کو ہمیشہ ان معنی میں پیش کیا جن معنی میں دنیا کے سب سے بڑے فقیر نے "الفقر فخری" فرمایا تھا۔ اسی لئے تو اقبال بھی فقیر کو بشرطیکہ وہ فقیر ہو، سے دنیا کی تمام نعمتوں سے بڑھ کر سمجھتا ہے؎

فقیرِ راہ کو بخشے گئے اسرارِ سلطانی
بہا میری نوا کی دولتِ پرویز ہے ساقی

اقبال نے جس دور میں جنم لیا تھا۔ اس دور کے ہندوستانی مسلمان اپنی تمام خصوصیت گنوا چکے تھے اور اسلامی تصورِ حیات کا کوئی واضح اور صحیح نقشہ انکے پیشِ نظر نہ تھا۔

وہ تصوف جو مسلمانوں کی روحانی اخلاقی اور عملی زندگی کا ایک اہم جزو بنا ہوا تھا۔ سراسر غیر اسلامی تھا۔ اس تصوف میں رہبانیت اور تیاگ کے ان غیر اسلامی عناصر کا امتزاج نظر آتا تھا۔ جنکے استیصال کا اسلام مدعی ہے اس تصوف میں ہند و تہذیب اور فرنگی ذہنیت کے زیرِ اثر وہ فنا پسند تصورات شامل ہو گئے تھے جنکے خلاف اسلام کا پیش کردہ تصورِ حیات ایک زبردست احتجاج ہے۔

غرض ہند و تہذیب اور ہندو دھرم کے زیرِ اثر مسلمانوں نے بھی بھوکا مرنے۔ ننگا رہنے۔ ناچنے۔ گانے اور بھیک مانگنے ہی کو فقیر سمجھ رکھا تھا۔ انکی نظریں وہاں تک نہ پہنچی تھیں جہاں اقبال کی نظریں پہنچ چکی تھیں کہ فقیر وہ نعمت ہے جو بادشاہوں کو بھی نصیب نہیں ہوتی اور یہ وہ مرتبہ ہے جو ہر کس و ناکس کو عطا بھی نہیں ہوتا؎

مقامِ فقر ہے کتنا بلند شاہی سے
روش کسی کی گدایانہ ہو تو کیا کہیے

اقبال کے زمانہ میں اور اس سے قبل بھی ہندوستان میں مفلسی، عاجزی، انکساری، بے عملی، فرائض سے کنارہ کشی، احساس ناطاقتی اور مجبوری ہی کا نام فقر رکھا جاتا تھا۔ سعی پیہم سے فرار سماجی و مجلسی زندگی کے عائد کردہ قوانین سے دور بھاگنا۔ اپنے آپکو کمزور و ہیچ سمجھنا۔ دنیا کے کارخانے کو تخلیقِ عالم کی غرض و غایت سے لاعلم ہو کر اسے ایک بیکار چیز جاننا۔ زندگی کے مقاصد پر غور و فکر نہ کرنا۔ بلکہ انکو بازیچۂ اطفال کا درجہ دینا بھی فقر سمجھا جاتا تھا اور اقبال اسی فقر سے بیزار ہو کر کہتے ہیں؎

اٹھا میں مدرسہ و خانقاہ سے غمناک
نہ زندگی۔ نہ محبت۔ نہ معرفت۔ نہ نگاہ

اور اقبال کا سارا فلسفۂ خودی جو انکے تمام کلام کا حاصل ہے اسی شدید خواہش کی بنیاد پر تعمیر کیا گیا ہے کہ انسان کو اس کے صحیح مقام سے آگاہ کیا جائے اسی لئے اقبال فقر کو بے عملی اور ترکِ دنیا سے تعبیر نہیں کرتا۔ وہ محض خانقاہوں کے کونوں میں بیٹھ کر

ذکر و فکر سے نفس کشی کرنے والوں کو فقر کا درجہ دینا نہیں چاہتا۔ اور اسی لئے اس نے غیر اسلامی عناصر تصوف کو الگ کر کے لوگوں کو زندہ حقیقی تصورِ فقر سے آشنا کیا۔ اور اس کا فقر درحقیقت مذہب اسلام کا ہی بنایا ہوا فقر ہے۔ بلکہ اقبالؔ کے نزدیک تو اسلام کا دوسرا نام بھی فقر ہے۔

لفظ اسلام سے یورپ کو اگر کد ہے تو خیر
دوسرا نام اسی دین کا ہے فقرِ غیور

غیرت مندی، حق گوئی، دلیری، بلند نظری، آزادی جیسی نعمتیں اقبالؔ کے فقر کا ثمر ہیں۔ اور یہ ایسا سرمایہ ہے جس کے آگے روم و شام کی سلطنتیں بھی کچھ حقیقت نہیں رکھتیں۔

مردِ درویش کا سرمایہ ہے آزادی و مرگ
ہے کسی اور کی خاطر یہ نصابِ زر و سیم

لیکن جہاں اقبالؔ نے فقر کا صحیح اور صالح تصور پیش کیا ہے اور اسے حاصل کرنے کی تلقین کی ہے وہاں ساتھ ساتھ یہ بھی صاف صاف بتا دیا ہے کہ جو اقوام فقر کی راہ پر چلتے چلتے رک جاتی ہیں، یا اپنا رخ دوسری سمتوں میں موڑ لیتی ہیں، وہ ترقی کے زینے سے گر کر ذلت و بے چارگی کی عمیق غاروں میں جا گرتی ہیں۔

یہ فقرِ مردِ مسلماں نے کھو دیا جب سے
رہی نہ دولتِ سلمانی و سلیمانی

"میں نے بلندی کو عاجزی اور فخر کو فقر میں پایا۔"

حضرت اویس قرنیؓ

خلیل رامپوری

جب تیری آنکھ میں آنسو ہوگا
وہ بھی اک جیت کا پہلو ہوگا

دل سمجھتا ہے جسے - تو ہوگا
کوئی اڑتا ہوا جگنو ہوگا

جو ہر اک دل کے قریں بستا ہے
وہ ترے جسم کی خوشبو ہوگا

جس پہ قائم ہے مدارِ خورشید
وہ بھی تیرا خمِ ابرو ہوگا

چوٹ کھاتے ہیں ہنسے جاتے ہیں
کیا کوئی ہم سا بھی خوش خو ہوگا

اس اندھیرے میں ابھرتا سایہ
کوئی آوارہ لبِ جو ہوگا

چاندنی رات کا پُر کیف سماں
قابلِ دیدِ لبِ جو ہوگا

اب وہاں جا کے بسیں گے کہ جہاں
ابر بھی ——— سایۂ گیسو ہوگا

سید مقبول حسین
تھرڈ ایر (سائنس)

عدم کی شاعری

عدم کے نام سے کون واقف نہیں ــــ موجودہ دور کے وہ شاعر ــــ جو زندگی کو جام و سبو اور ساغر و مینا کے روپ میں پیش کر رہے ہیں ــــ عدم کا نام ان سب میں سرِ فہرست ہے! عدم کی شاعری مدد میں ڈوبا ہوا ایک شعر ہے ــــ! اس میں زندگی کی لہر ــــ صرف چھلکتے ہوئے ساغر کے روپ میں پائی جاتی ہے ــــ!

زندگی نام ہے جہدِ مسلسل کا ــــ یہ ایک کشمکش ہے طویل کشمکش ــــ! مگر اس نے یہ ساری طوالت ایک جام میں ڈال دی ہے! اس کے شعروں میں تلخی پائی جاتی ہے ــــ مگر اس تلخی میں کتنی شیرینی ہے ــــ یہ صرف اس کی کتابیں پڑھنے والے ہی اندازہ لگا سکتے ہیں ــــ! حسن و عشق کی تعریف ــــ ساقی و مے خانہ ــــ ساغر و مینا ــــ یہ ہیں عدم کی شاعری کے حسین جزو ــــ بہرحال عدم کی شاعری موجودہ دور میں ایک عظیم مقام رکھتی ہے ــــ آنے والی نسلیں اسے غالب، حالی اور میر سے کم درجہ نہ دیں گی! حسن کی تعریف اس کے شعروں میں کچھ زیادہ ہی ہے! اور ــــ اس کی تعریف کرتے وقت وہ اپنے گرد و پیش سے بھی غافل ہو جاتا ہے ــــ! بس اسے ہر طرف حسن و عشق کے سرچشمے نظر آتے ہیں ــــ! مثال حاضر ہے ؎

ایک ریزہ تیرے تبسم کا ــــ اُڑ گیا تھا شراب خانے سے
موجِ کوثر بنا دیا جس کو ــــ واعظوں نے اک بہانے سے

عدم کی یہی خوبی ہے کہ وہ اپنی شاعری میں شرابِ حسن اور اس کے اثرات بیان کرتا ہے ــــ اس کے نزدیک ہر شخص شرابی ہے ــــ کوئی بھی تو نہیں جو اس سے بچا ہو ــــ! تبھی تو وہ لکھتا ہے ؎

کون ہے جس نے نہیں چکھی ــــ کون جھوٹی قسم اٹھاتا ہے
میکدے سے جو بچ نکلتا ہے ــــ تیری آنکھوں میں ڈوب جاتا ہے

عدم کے دل میں درد ہے۔ اسے اپنے دوستوں سے محبت ہے۔ خواہ وہ دوست بے وفا ہی کیوں نہ ہوں ــــ یہ شعر اسکے دردمند دل کا حقیقی آئینہ دار ہے ؎

زندگی کے اداس لمحوں میں ــــ بے وفا دوست یاد آتے ہیں

'عمرِ رفتہ' ــــ عدم نے عمرِ رفتہ کے متعلق بھی بہت کچھ لکھا ہے۔ وہ اگرچہ یہ چاہتا ہے کہ ہر دم جامِ مے میں ڈوبا رہے ــــ مگر پھر بھی کبھی کبھی عمرِ رفتہ سے شکوہ کر ہی دیتا ہے ــــ ملاحظہ ہو ؎

عمرِ رفتہ صدا تو دے مجھ کو ــــ بے مروت تجھے قریب ہوں میں

عدم ایک بیباک شاعر ہے ــــ وہ دلیر ہے ــــ خوددار ہے ــــ خالقِ کائنات کا احترام ہے اس کے دل میں ــــ مگر اس کے باوجود اس میں اتنی بیباکی ہے کہ وہ اپنی شکایات اس کے سامنے بیان کر سکیگا ــــ کہتا ہے ؎

آج دن ہے عدم قیامت کا ــــ کھل کے یزداں سے گفتگو کر لے

اس کی شاعری میں خودی ہے ــــ اعتماد ہے ــــ صرف خم و ساغر اور ساقی و مینا ہی کا چرچا نہیں ــــ! اس کے شعروں میں دل کا درد بھی ہے اور زندگی کی رنگینیاں بھی ــــ! زندگی اسکے نزدیک شراب کی طرح رنگین اور تلخ و ترش ہے ــــ کہتا ہے ؎

دیکھی نہیں ہے تُو نے کبھی زندگی کی لہر،
اچھا تو جا عدؔم کی صراحی اٹھا کے لا!

اس کی شاعری میں حقیقت ہے ــــ سماج پر گہرا طنز ہے ــــ وہ کسی سے نہیں ڈرتا ــــ امیروں کے متعلق اس نے صرف جذبات ہی پیش نہیں کیے ــــ بلکہ ان کے مظالم ــــ خود غرضی ــــ اور عیاشی کو بھی شعروں کے رُوپ میں ڈھال کر اُن کی حقیقت کو اُجاگر کیا ہے! اس کے اِس شعر سے اس امر کی اچھی طرح وضاحت ہو جاتی ہے ؎

واقعہ ہے کہ اہلِ سرمایہ ٭ مطلقاً عام نہیں پیتے
انکا معیارِ مے کشی نہ پُوچھ ٭ خون پیتے ہیں مے نہیں پیتے

عدؔم کے دل میں بھی اپنے محبوب کے لئے پیار ہے ــــ اور ــــ اُسے اپنے محبوب سے کتنا پیار ہے، اِس شعر سے اندازہ کریں ؎

محشر میں اِک سوال پوچھا کریم نے
مجھ سے وہاں بھی آپ کی تعریف ہو گئی

غرض اُردو ادب میں عدؔم کی شاعری ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ ایک ایسی شمعِ فروزاں ہے جس میں شراب کی چمک اور اس کی تپش ــــ ساقی کا دمکتا اور دلربا حُسن ــــ خُم و ساغر کی رنگینی ــــ اور ــــ عمرِ رفتہ کی یاد شامل ہے۔ اس کی شاعری حقیقت پر مبنی ہے۔ اس کا ہر شعر ــــ بیباکی اور دلیری کی زندہ مثال ہے ــــ اس کے ہر شعر میں سرور ہے ــــ تلخی ہے ــــ شیرینی ہے ــــ اس کی شاعری ہمیشہ زندہ رہے گی! اور اس کا نام ــــ ہمیشہ شاعروں کی دُنیا میں اُونچا رہے گا ــــ!

محمد اقبال اختر
سیکنڈ ایر (آرٹس)

کتنی افسُردہ تمنّاؤں کا ہے دل میں ہجوم
کیا کہوں تجھ سے کہ اک قلبِ تپاں رکھتا ہوں میں

بے زبانی حاملِ ذوقِ تکلّم ہے ندیم
ورنہ کہنے کیلئے اک داستاں رکھتا ہوں میں

دل وہ رکھتا ہوں جسے صدمے کی سہنے پڑے
جو لہو روئی وہ چشمِ خوں فشاں رکھتا ہوں میں

میری آشفتہ سری نے مجھ کو رُسوا کر دیا
ورنہ پلکوں میں ہزاروں کہکشاں رکھتا ہوں میں

کچھ نہیں پروا اگر ناراض ہیں اہلِ جہاں
اپنے حق میں اک وجودِ مہرباں رکھتا ہوں میں

طنز و مزاح

ایم۔ الیاس
نورتھ ایر (آرکاٹ)

ہوئے تم دوست جس کے .....

زمانہ بدل گیا مگر نہیں بدلے تو ہمارے دوست طفیل صاحب۔ لیکن میرا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ بالکل ہی دقیانوسی آدمی ہیں۔ بس یوں سمجھ لیجیے کہ پرانی اور نئی تہذیب کا معجون مرکب ہیں۔ جہاں تک لباس کا سوال ہے وہ تہذیب یافتہ ہیں یعنی کوٹ پتلون زیب تن کرتے ہیں اور پرانی تہذیب کے نشانات چہرے پر بڑھی ہوئی داڑھی اور سر پر رکھی ہوئی ٹوپی سے ملتے ہیں۔ اگر ان کی باتیں سنیئے تو احساس ہوگا کہ اپنے وقت کے بعد پیدا ہوئے ہیں۔

طفیل صاحب بڑے با اصول آدمی ہیں۔ اقبال کا شعر ؎

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

ان کا ماٹو ہے۔ ویسے فی الحال یہ خودی کی اُن منزلوں تک تو ابھی نہیں پہنچے جہاں خدا خود اُن سے اِن کی رضا پوچھتا ورنہ بی۔ اے اس دفعہ تو ضرور پاس کر لیتے کیونکہ یہ تیسرا سال ضائع ہوا ہے لیکن اس بات کا افسوس انہیں خدا پر نہیں بلکہ یونیورسٹی پر ہے جس نے ان کی خودی کو سخت مجروح کیا ہے۔ اب تین سال کی مسلسل ناکامی سے دل برداشتہ ہونا تو ان کی فطرت کے خلاف ہے۔ چنانچہ وہ زہر پی کر مرنے یا ریلوے لائن پر سر رکھنے کی بجائے اس آخری نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ امتحان ان کی خودی کی تعمیر میں سب سے بڑی روک ہیں۔ اس لئے امتحان جیسی نامعقول چیز کا وجود نہیں ہونا چاہیئے۔ اب عنقریب یہ اربابِ تعلیم کو اِس مضمون کا خط لکھ رہے ہیں کہ اے قدر ناشناسو تم نے ہزار ہا نااہل طلباء کو تو پاس کر دیا لیکن میں کہ سب سے زیادہ اس بات کا اہل تھا کہ پاس کیا جاتا مسلسل صدمے برداشت کر رہا ہوں اور صرف اپنی خودی کی بدولت زندہ ہوں۔ میں تو وہ ہوں کہ کلاس میں پروفیسر تک میری جرح سے ڈرتے ہیں لیکن تمہارے نظامِ تعلیم نے مجھے بھسڈی سمجھ لیا ہے۔ میں مطالبہ کرتا ہوں کہ ایسا نظامِ تعلیم قائم کیا جائے جس میں امتحانوں کا سرے سے وجود ہی نہ ہو۔

اگر یونیورسٹی ان کا مطالبہ تسلیم نہ بھی کرے تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ طفیل صاحب کے مکان پر "بابر طفیل ایم۔ اے" کا بورڈ آویزاں ہے۔ ہماری جو شامت آئی تو ایک دن دبی زبان سے پوچھ لیا۔ حضرت آپ ایم۔ اے کب سے ہو گئے ہیں؟ دہاڑ کر بولے۔ حساب میں بالکل کورے ہو کیا؟ اس وقت درحقیقت میں ایم۔ اے کر چکا ہوں۔ مگر تم سمجھتے ہو کہ یونیورسٹی کی سند لازمی ہے۔ مجھے اس کی کوئی پرواہ نہیں ——— تمہاری طرح ڈگری لیکر کہیں کلرکی کے انٹرویو میں بیٹھنا تو نہیں کہ اس کا ہونا لازمی ہو۔ میری خودی مجھے مجبور کرتی ہے کہ علم برائے علم کا قائل رہوں۔

خیر سے باذوق بھی بڑے ہیں۔ اردو میں آزاد شاعری کے زبردست حامی ہیں۔ غالب کے کلام پر تنقید بھی کرتے ہیں۔ ایک شعر کی تشریح سنئے۔ شعر ہے ؎

جز قیس اور کوئی نہ آیا بروئے کار
صحرا مگر بہ تنگیٔ چشمِ حسود تھا

فضیل صاحب فصاحت و بلاغت کے دریا بہاتے ہوئے فرماتے ہیں۔

قیس یعنی مجنوں لیلیٰ کے پاس جانا چاہتا تھا مگر صحرا بہت بڑا تھا اسلئے اس نے فوراً کار کا انتظام کیا اور بذریعہ کار صحرا کو اتنی تیزی سے عبور کیا کہ وہ بڑا صحرا چھوٹا معلوم ہونے لگا۔

اس تشریح سے ہمارے تو چودہ طبق روشن ہو گئے۔ لہٰذا ہماری یونیورسٹی سے یہ درخواست ہے کہ ایم۔ اے تو یہ خود ہی بن گئے ہیں۔ وہ ازراہِ کرم انہیں پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری دے۔

میری شامتِ اعمال سے وہ آجکل مجھ سے کچھ ناراض ہیں اور ناراضگی کی وجہ "خودی" کا موضوع تھا۔ میں نے ان سے لفظِ خودی کے معنی پوچھے اور یہ اسے اپنی توہین سمجھتے ہوئے ناراض ہو گئے۔ کل ہی میں نے جرأت کر کے پوچھا کہ حضرت میرا قصور کیا ہے۔ یہ سُنکر ٹھنڈی سانس بھری اور فرمایا۔ تمہارا کچھ قصور نہیں شکایت تو مجھے گردشِ آسمان سے ہونی چاہیئے جس نے ہمیں دوست بننے کے بعد جُدا کر دیا بہرحال میری خودی گوارا نہیں کرتی کہ تم سے تعلق رکھوں۔ اس "فلمی" طرزِ تخاطب سے میں بوکھلا گیا اور کہا کہ جناب آپ کو شکایت تو گردشِ آسمان سے ہے اور ناراضگی مجھ سے۔ تو کیا گردشِ آسمان میرے کنٹرول میں ہے جو آپ مجھ سے ناراض ہیں؟ بس صاحب وہ اس بات کو اپنی ایک اور توہین قرار دیتے ہوئے چل دیئے۔ میں نے انہیں بہتیرے ان کی خودی کے واسطے دیئے لیکن وہ آج بھی مجھ سے ناراض ہیں۔ اور نہ جانے کب تک ناراض رہیں ۔

"جلدی معاف کرنا شرافت اور جلدی انتقام لینا کمینگی ہے۔"

(حضرت علی رضی اللہ عنہ)

سید الیاس بشیر احمد

تھرڈ ایر (آرٹس)

دِل کا جب تک مزار باقی ہے
عشق کی یادگار باقی ہے

وہ جو تھوڑی سی پی تھی صبحِ ازل
اس کا اب تک خمار باقی ہے

اُن کے آنے کی آس ٹوٹ چکی
پھر بھی اک انتظار باقی ہے

ق

بُلبلِ سوگوار تیرے طفیل
یادِ فصلِ بہار باقی ہے

تُو نے پھولوں سے دل لگایا تھا
پھول باقی نہ خار باقی ہے

اُن کے ملنے کی آرزو ہی سہی
کچھ تو یہ یادگار باقی ہے

تُو نے ٹھکرا تو دیا لیکن دوست
تیری آنکھوں میں پیار باقی ہے

کوئی حسرت ہے اور نہ ارماں ہے
اک دلِ داغدار باقی ہے

مہلتِ یک نفس تو دے اے عمر!
حسرتوں کا شمار باقی ہے

عشق بدنام ہو گیا الیاس
عقل کا اعتبار باقی ہے

م۔ ا۔ فرخ
سیکنڈ ایر (آرٹس)

خواب اور حقیقت

(نوٹ:۔ اس مضمون میں لفظ "خواب" سے مراد رؤیا و کشوف نہیں ہیں۔)

رات کو جب دن کا تھکا ماندہ انسان آرام کے لئے بستر پر لیٹتا ہے تو طرح طرح کے خیالات اس کے دماغ میں پناہ گزین ہو جاتے ہیں جو کہ سونے کے بعد خواب کی شکل میں رونما ہوتے ہیں۔

یہ خیالات غریب یا امیر میں امتیاز کئے بغیر عموماً تمام ذہنوں پر مسلط ہوتے ہیں۔ لاشعوری تخیلات کی یہ بلند پروازیاں ریت کے کئی محل تعمیر کرتی ہیں جو کہ آنکھ کھلنے کے ساتھ ہی زمین بوس ہو جاتے ہیں۔ غرض کچھ ایسے خیالات انسان کے دماغ میں جنم لیتے ہیں کہ اگر وہ حقیقت کا روپ دھار لیں تو نظامِ ہستی درہم برہم ہو جائے۔

مثلاً ایک شخص خواب دیکھتا ہے کہ وہ بادشاہ بن گیا ہے شاہی محلات اس کے لئے تعمیر کئے جا رہے ہیں۔ نوکر چاکر آگے پیچھے پھر رہے ہیں اور اس کا حکم قانون کی حیثیت رکھتا ہے۔ آنکھ کھلنے پر اگر وہ خواب حقیقت ہو جائے تو ایک ہی ملک میں دو بادشاہ ہو جائیں۔ پھر یہ ممکن نہیں کہ بادشاہت سے متعلق خواب صرف ایک شخص کو ہی آئے ہوں بلکہ ممکن ہے کہ کئی اور بھی اسی طرح رسم تاجپوشی ادا کر چکے ہوں اور دن چڑھتے ہی ہر بادشاہ اپنی علیحدہ سلطنت کی حدیں ناپ رہا ہو۔ کوئی چار سپاہیوں کی فوج اکٹھی کر کے سکندر اعظم جیسے منصوبے باندھ رہا ہو۔ تب تو رعایا کم اور بادشاہ زیادہ ہو جائیں اور تاریخ کے طلبا کو بجائے بادشاہ کے رعایا کے نام یاد کرنا پڑیں۔

بعض خواب مال و دولت سے متعلق بھی آتے ہیں کہ فلاں مر گیا ہے اور اس کی تمام جائداد کے حقوقِ ملکیت اس خاکسار کے ہاتھ لگے ہیں۔ یا کسی چیز کے بیچنے سے کافی رقم ملی ہے۔ اس موقعہ پر ایک دیہاتی کا خواب قابلِ ذکر ہے جو لطیفہ کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔

ایک دیہاتی نے خواب دیکھا کہ وہ ایک بکری بیچ رہا ہے گاہک چالیس روپے دینے پر مصر ہے اور مالک ساٹھ روپوں پر اڑا ہوا ہے۔ اسی چالیس اور ساٹھ کے جھگڑے میں دیہاتی کی آنکھ کھل گئی تو بیداری میں بھی ساٹھ کا فقرہ ہی زبان پر تھا۔ بیچارہ ذرا سادہ لوح تھا، ساٹھ کے پیچھے جب چالیس کو بھی جاتے دیکھا تو دوبارہ آنکھیں بند کر کے ہاتھ پھیلا کر کہنے لگا "چلو تم چالیس نہ دو دس ہی دے دو۔ مگر۔۔۔۔" وائے قسمت! یہ تو خواب تھا نہ کہ حقیقت۔ بیچارہ کیا کیا ارمان لئے بیٹھا ہو گا کہ آنکھ کھل گئی۔

سال میں ایک دو دفعہ ایسی بہار بھی آتی ہے جبکہ کالج یا سکول کے "حاجی" امتحان کو نزدیک پا کر طرح طرح کے خواب دیکھتے ہیں اور دل کو انہیں سے ڈھارس دیتے ہیں کہ شاید خواب حقیقت ہی ہو۔ صبح صبح ان دنوں جب آپ کالج میں یا سکول میں داخل ہوں گے تو یہ حاجی طلبا ساتھیوں کے سامنے نہایت مفکرانہ اور فلسفیانہ انداز میں باتیں کر رہے ہوں گے۔ دور سے اگر آپ دیکھیں تو ایسا معلوم ہو گا کہ شاید انہوں نے کوئی کافی زبردست مہم جیتی ہے۔ جس کو وہ اب ساتھیوں کے سامنے بیان فرما رہے ہیں مگر جب ذرا نزدیک سے گزرنے کا اتفاق ہو تو آپ یہ جان کر حیران ہوں گے کہ وہ کوئی معرکہ سر کر کے نہیں آئے بلکہ اپنے کو (Scnior) بننے کے لئے امتحان سے متعلق اپنے خواب بیان کر رہے ہیں۔ جو کہ کچھ اس طرح ہوں گی ـــــ مثلاً بیان کر رہے ہوں گے کہ رات کو ذرا تاریخ

کی کتاب پڑھتے پڑھتے آنکھ لگ گئی تو دیکھا کہ ایک نورانی چہرہ بزرگ میرے پاس تشریف لائے اور امتحان کی تیاری میں محو دیکھ کر اور اسکے فکر میں مستغرق پا کر میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور فرمانے لگے کہ "جا! تیری مراد پوری ہوئی۔ تُو ہر امتحان میں کامیاب ہوگا" پھر بعض تو یہاں تک رسائی حاصل کر لیتے ہیں کہ امتحان کے تمام پرچے ہی ان پر ظاہر ہو جاتے ہیں اور وہ بڑے وثوق سے اپنے ساتھیوں کے سامنے ان پرچوں کا ذکر کرتے ہیں حالانکہ یہ "مجاز" طلباء مدتوں سے سکول یا کالج کی فیل ہونے والی ٹیم کے سرگرم رکن ہوتے ہیں اور جرمانوں وغیرہ سے کالج یا سکول کی کافی مدد کر رہے ہوتے ہیں اب انکی خوابوں کو معدہ کی خرابی ہی کہیئے جنکو حقیقت سے دُور کا بھی واسطہ نہیں ہوتا کیونکہ "مجاز" لوگ کتابوں اور لیکچروں سے زیادہ ان ہی خوابوں پر زیادہ اعتماد رکھتے ہیں۔ اور یہی امید انکی تباہی کا موجب ہوتی ہے کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ شاید یہ خوابیں حقیقت ہو جائیں۔

ایسے ہی بدہضمی اور قبض سے تیار شدہ خوابیں اکثر ناکارہ اور پہلوان قسم لوگوں کو آتی رہتی ہیں جو کہ اگر حقیقت کا لبادہ پہن لیں تو انسان کی زندگی سراپا غم اور رنج والم کا گھر بن جائے۔ ایسی ہی ایک خواب میرے ایک دوست نے چند دن قبل دیکھی جسکو سناتے وقت بھی اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے مگر شکر ہے رب العلمین کا جس نے ایسی خوابوں کو حقیقت نہیں بنایا۔ خواب یہ تھی کہ ایک ریچھ اچانک انکی چارپائی کے نیچے سے نکل کر حملہ آور ہوا اور انکی ناک پکڑ کر زور زور سے جھنجھوڑنے لگا۔ بیچارے حواس باختہ ہو گئے اور ایک دلدوز چیخ کے ساتھ آنکھ کھول دی۔ مگر بیداری کے بعد معلوم ہوا کہ جناب کی ناک کو ریچھ نے نہیں بلکہ خود ان کی انگلیوں نے پکڑا ہوا ہے اور آپ ہی ناک کو زور زور سے ہلا رہے ہیں۔

اسی طرح بعض اوقات ہم خواب میں دیکھتے ہیں کہ ہم بھاگنا چاہتے ہیں تو زبان خشک ہو جاتی ہے اور بعض دفعہ ایسے بھیانک منظر نظر آتے ہیں اور ایسے حادثات اور واقعات سے خواب کی حالت میں دوچار ہونا*

شیخ جمیل شاہین
سیکنڈ ایر (آرٹس)

○

اِک ذرا مجھ پر بھی ہو جائے تیری نظرِ کرم
عمر بھر یہ تیرا طالب تیرا دیوانہ رہے

اِس قدر کھو جاؤں تیری یاد میں اے جانِ مَن
روزِ محشر ہر زباں پر میرا افسانہ رہے

مَیں سراپا ہوں فدا اس التفاتِ چشم پر
میری جانب مُسکراتی نظرِ جانانہ رہے

آج پھر سے نوش کو اتنی پلا دے ساقیا
جام بھی خالی نہ ہو گردش میں پیمانہ رہے

گر مجھے آشفتہ سر کہتے ہیں سچ کہتے ہیں لوگ
یہ کبھی ممکن نہیں عاشق بھی فرزانہ رہے

مَیں تو شاہیں جانتا ہوں زندگانی کا مآل
کیوں ڈرے مرنے سے وہ جو اس کا دیوانہ رہے

* پڑتا ہے کہ آنکھ ایک چیخ کے ساتھ کھل جاتی جس کا اثر دیر تک دل و دماغ پر رہتا ہے۔ اِن باتوں سے ظاہر ہے کہ ایسے خواب اگر حقیقت بن جاتے تو انسان کا زمین پر قیام ناممکن ہوتا ٭

سلیم اختر صدیقی
فورتھ ایر (آرٹس)

ہوا ہے زلفِ پریشاں سے مجھ کو اندازہ
بکھر چکا ہے سکونِ جہاں کا شیرازہ

صنم کدہ میں پجاری کہاں سے لوٹ آئے
کسی نے کھولا ہے شاید قفس کا دروازہ

شفق میں آج یہ کیسی بلا کی سرخی ہے
کہ خونِ دل کو بنایا ہے حسن کا غازہ

غمِ صنم کا یہ سرمایہ کس نے چھین لیا
مرے قصور کا کتنا بڑا ہے خمیازہ

بساطِ ذہن پہ بکھیرا انڈیل دی اختر
جنوں کی پیاس بجھانے کو میں نے مئے تازہ

محمد ہادی مونس
بی۔ اے (اولڈ بوائے)

ہزار صورتیں مسجود ہیں یہاں ہر سُو!
مری نظر میں ہر اک چیز میں ہے تُو ہی تُو!

ہے اُن کے سینوں میں پنہاں تڑپ محبت کی
جو کرتے پھرتے ہیں اس مے کا ذکرِ رنگ و بُو

مرے مزاج پہ یُوں شک نہ کر خدا کے لئے
گواہ ہے میری اُلفت پہ میرا اند لہو

جو لوگ ہوتے ہیں شیدائی رُخِ گلرنگ
وہی سمجھتے ہیں ترا اشارۂ ابرُو

تُو میرے رنج و الم کا صلہ عطا کر دے
نہ یہ کہ مجھ سے چھپا لے تُو اپنا جلوۂ رُو

دلوں کی میل نہ جب تک ہو دور اے مونس
نہیں ہے کچھ بھی حقیقت میں پنج وقتہ وضو

س۔ ل
ایم۔ اے

ٹالسٹائی دا نظریۂ فن

کاؤنٹ لیو ٹالسٹائی (١٩١٠-١٨٢٨) دا روسی ادب وچ بڑا اُچا درجہ اے۔ اوہ اِک کھاندے پیندے گھر وچ جمیاں۔ کجھ چر فوج وچ ملازم رہیا پر عاماں دیاں مصیبتاں تے اوہناں دے دُکھ درد اوہدے کولوں نہ ویکھے جا سکے۔ اوس نوکری چھڈ کے قلمکاری شروع کر دتی۔ ٹالسٹائی بڑے ستھرے وچار دا آدمی سی۔ اوہدیاں لکھیاں ہوئیاں چیزاں وچوں اسیں اوہدے نظریات لبھ سکدے آں۔ ١٨٦٢ء وچ جدوں اوہدی عمر چالی ورھے سی اوس نے ویاہ کر لیا تے اِک پنڈ وچ آباد ہو گیا۔ ایس توں پہلاں اوہدے دو مشہور ناول "امن تے جنگ" تے "اینا کرینینا" چھپ چکے سن۔ عمر دے آخری حصے وچ اوہنوں تصوف دا چسکا وی لگ گیا سی۔ فن دے بارے وچ ٹالسٹائی دا اِک اپنا وکھرا نظریہ اے۔

ٹالسٹائی دے خیال وچ فن اوس جذبے دا ناں ہے جیہڑا دوجیاں تیک پہنچایا جاوے۔ جدوں فن کاراں وچوں کوئی مصور، شاعر، بُت گھڑ تے بھانویں موسیقار کسے شے دے بارے اِک ڈاہڈا جذبہ اپنے اندر محسوس کردا اے تے پھر ایس جذبے نوں اوہ رنگاں، مٹی کھچویاں سُراں، سوہنے ستھرے لفظاں یاں گھڑے ہوئے پتھراں دی صورت وچ باہر لے اوندا اے تے ایہناں چیزاں نوں دُوجے لوک وی ویکھدے نیں تے ٹالسٹائی آکھدا اے پئی ایہ سارا عمل فن اے تے اوہ چیز فن پارہ اکھاندی اے۔

ایس طرح فن دے بارے وچ اوس پُرانے سوال ——— پئی فن پاریاں وچ اِکو جہیاں قدراں کیہڑیاں ہندیاں نیں ——— دا جواب سانوں اوہدے وچوں ایہہ ملدا اے پئی ساریاں فن پاریاں وچ سانجھی قدر اے تے جذبے دی مکمل COMMUNICATION ہندی اے۔

ایس نظریے دے خلاف بڑے اعتراض کیتے گئے نے۔ پہلا ایہہ پئی ٹالسٹائی دا نظریہ سانوں ایہہ نہیں دسدا پئی فن دی گھڑت لئی جذبے دی کیہڑی قسم اے جدی COMMUNICATION ہونی چاہی دی اے۔ اِک اجیہا آدمی جدیاں مشکلاں کتیاں ہوئیاں ہون اتے جذبے دی EXPRESSION تے ایس اوہدے کول دی اوہدیاں چیکاں تے آہاں دی صورت وچ سُن سکدے ہاں تے ایہوای اوس آدمی دے جذبے دی COMMUNICATION ہووے گی۔ پر اوس آدمی دیاں چیکاں نوں فن کوئی نہیں آکھے گا۔ ایہدی وجہ اسیں ایہوای کڈھاں گے پئی اصل وچ اوہ جذبہ ای اصلی نہیں سی۔

دوجی گل ایہہ دسے پئی ایہہ گل تے سارے منندے نے پئی فن پارے درجیاں وچ اِک دوسرے نالوں ہر حال وچ وکھرے ہوندے نے۔ اوہناں وچوں کئی تُوت اُچے نے تے تاں زندہ رہن والے ہوندے نے تے بعضیاں دی بنیاد اِک دن وی نہیں ہوندی۔ ایہہ تے مننی ہوئی گل اے پئی دوں فن پاریاں وچوں اِک ضرور اُچیاں قدراں

دا مالک ہوندا اے۔ باخ تے دوجے آرٹ دے نغمے۔ ریمبراں تے
لیونارڈو ڈاونچی دیاں تصویراں۔ برنارڈ شا تے شیکسپیئر دے ڈرامے
کسے نہ کسے لحاظ نال اِک دوسرے نالوں کتے ودھ ضرور چنگے ہوویں
ہو جاندے سن۔ ٹالسٹائی دے فن دے بارے نظریے دے مطابق
دنیا دے گنے چنے فن پارے ای فن دے سچے وچ پورے اُترن گے۔
ٹالسٹائی اگے چل کے تھوڑے فن دی ترجمانی لوکاں وچ اوہدی
مشہوری تے مقبولیت دی رکھدا اے۔ حالاں دنیا دے بوتے لوک
یاں تے فن توں اُوج ای ہٹ کے گزدے نے یاں اوس توں وکھرای
دہاپسند کردے نے تے بعض حالتاں وچ۔ بے سُری موسیقی نوں چنگیاں
نغمیاں تے راگاں توں وی اچا جاندے نے۔ ایسے طرح سالیاں
وچ چھپیاں ہوئیاں ننگیاں تے بھیڑیاں مورتاں نوں آرٹ گیلری
دیاں تصویراں نالوں ودھ سمجھدے نے۔ پُن جے ایہی مقابلہ کریئے
تے پتہ لگدا اے پئی اُچے فن پارے بے سُری موسیقی تے ننگیاں
تصویراں نالوں کتوں بوت تھوڑیاں دلاں وچ جذبے نوں ٹانہہ
چکنے دا موجب ہوندے نے۔ کسے اُچے فن پارے ویکھدیاں ای
اوہدی رُوح نوں سمجھ لینا کوئی آسان تے معمولی گل نہیں۔ ایہدے لئی
اِک لمی عمر تے اِک ویکھن والی اکھ چاہی دی اے۔

اصل وچ لوکاں دی پسند نوں فن دا تجزیہ آکھن لگیاں
ٹالسٹائی توں ایس کرکے غلطی لگی پئی روسی لوکاں نوں "ہملیٹ"
دے مقابلے وچ جدوں اوہنے اوہناں دیاں اپنیاں لوک گیتاں نوں
بوتا پسند کردیاں ہویاں ویکھیا تے اوہنے سمجھ لیا پئی ایہوای
اُچے فن پارے نے۔ حالاں ART تے AESTHETICS دیاں
مسلیاں نوں لوکاں دے سرگن کے ایس کردے دی حل نہیں کرسکدے
اصل وچ ٹالسٹائی دے ایس نظریے دے اُلٹ پئی فن پاریاں
وچ کسے جذبے دے اظہار دے COMMUNICATION ہوندی لئی [1]

لطف الرحمٰن محمود
نورتھا ایو (سائنس)

غزل

اسیں حُسن دی نگری جا وڑاں گے!
اوتھے پیار دے بول سناواں گے!
جنہاں گلیاں وچ دل کھسیا اے
اوتھے مُڑ مُڑ پھیرے پاواں گے!
تیرے در تے جے سجدے کرنے ہوئے
تیرے در ای ڈیرے لاواں گے!
سوہنے یار نوں رُسن نہیں دینا
سوہنے یار نوں کینویں مناواں گے!
کیوں سُولی توں سانوں ڈراؤندے او
اسیں اوتھے وی غزلاں گاواں گے!
ایہہ جگ دے زخم دی ہسدے نے
کتھے دُکھاں دے بوٹے لاواں گے!
اِس آس تے زندہ بیٹھے آں
کدی اکھیاں دی پیاس بجھاواں گے!

محمود جے یار دا لڑ پھڑیا
مُنہ منگیاں مراداں پاواں گے!

---

[1] دوں وکھریاں فن پاریاں نوں اِک دوسرے نالوں اڈ کرن والی شے اوہناں دا حُسن تے سندرتا ہوندی اے۔

منظور احمد شاکر
بی-اے (اولڈ بوائے)

کافی

ہے کوئی میرا جے درد ونڈا وے
جاندے یار نوں موڑ لیا وے
منتاں کیتیاں ترلے کیتے
ہتھ بنھ بنھ کے سجدے کیتے
پر ماہی نوں ترس نہ آوے
جاندے یار نوں موڑ لیاوے
ہے کوئی میرا
لمبیں رات جدائیاں والی
شاں شاں کردی ناگے کالی
ماہی باجھوں کھان نوں آوے
جاندے یار نوں موڑ لیاوے
ہے کوئی میرا
اوگن ویکھ کے رس گیا ماہی
پا گیا ئیں گل غم دی پھاہی
دل پیا خون دے نیر وہاوے
جاندے یار نوں موڑ لیاوے
ہے کوئی میرا
شاکر سکدیاں عمر گذاری
یار نہ ملیا عمراں ساری
دل کملا کیوں ڈھدا جائے
جاندے یار نوں موڑ لیاوے
ہے کوئی میرا جو درد ونڈاوے
جاندے یار نوں موڑ لیاوے

○

پسندیدہ اشعار

جب مر گئے تو آئے ہمارے مزار پہ
پتھر پڑیں صنم تیرے ایسے پیار پہ
کہتے رہے ہم ان سے دل زار کی حالت
سنتے رہے وہ غیر کا افسانہ سمجھ کر
میری قسمت میں غم گر اتنا تھا،
دل بھی یارب کئی دیئے ہوتے
کیا اس لئے تقدیر نے چنوائے تھے تنکے
بن جائے نشیمن تو کوئی آگ لگا دے
(محمود احمد خان - فرسٹ ایر - سائنس)

کسی مغرور کے آگے ہمارا سر نہیں جھکتا!
فقیری میں بھی اختر غیرت شاہانہ رکھتے ہیں
سامنے ہوں تو فدا کر دیں دل و جاں ان پہ
ہم نہیں جانتے اختر کہ عبادت کیا ہے
کچھ دیر کی مہمان ہے جاتی دنیا
اک اور گنہ کر لوں کہ توبہ کر لوں
(شاہد احمد سیکنڈ ایر - آرٹس)

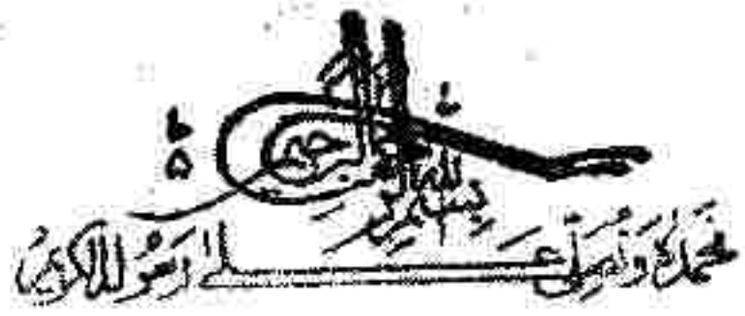

AL-MANAR

ORGAN

Talim-ul-Islam College

OF

RABWAH

January

1960

Chief Editor RASHID AHMAD

Printed at Lion Press, Hospital Road, Lahore and published by A. R. Junaid Hashmi
for the Talim-ul-Islam College, Rabwah.

CONTENTS

			Page
1.	Editorial	Rashid Ahmad	1
2.	Letters to the Editor	...	3
3.	Searing Aloofness	Rashid Ahmad	4
4.	Student Club	Rashid Ahmad	5
5.	Deity's Oblation	Rashid Ahmad	10
6.	(OBITUARY)		18
7.	Creation of a Piece of Art (Poem)	Zafar Mahmud, IV Yr.	19
8.	The College Bell	Kalim Ullah Khan, III Yr. (Arts)	20
9.	Africa	J. Msolomi, I Year (Arts)	21
10.	Malaria	M. N. Ahmad, II Year (Science)	23
11.	Peace and Islam	Saleem Akhtar, IV Year (Arts)	25
12.	Industrial Problems of Pakistan	A. Sami, IV Year (Arts)	28

Almanar

TALIM-UL-ISLAM COLLEGE MAGAZINE

Vol. VII	JANUARY, 1969	No. 1

Editorial

IT is sad to say that in answer to our repeated requests to the students to write something for *Almanar* they say that first they should be taught how to write or that they cannot write good prose or that they have nothing in their heads to say anything about anything.

Babes talk like this. "They are brought up by hand." They are fed with small pieces of bread. They need their elders' aid to grow up in this world. They are like mistletoe on oak. They stand in need of us who are in our teens and twenties. Why do we pose and behave like babes? Who will teach us now? It is we! Let us not be shy any more!

You can't write! To think of not having been able to write! Fie upon us! We should blush to say so. You can't be Hemingways or Zhigovs overnight. Their hair has grown grey with age. They have been writing since they learnt to write A.B.C.....They have been writing good and bad prose. They learnt to write good prose by writing about everything that their eyes caught, that their hearts felt and that their minds thought about.

...u see! You feel! You think! Write down what you see. Don't ...el small even if you like to write about a fly—a dirty, mean thing. You may write something very interesting about a fly. Just think how a poet of no great repute has written so beautifully and suggestively about a fly that after reading his lines one never likes to hate or kill a fly.

Don't mistreat a fly.
He wrings his hands,
He wrings his feet!

Then you feel. You feel sometimes that you want to win over the heart of someone you are sweet upon. But when you come face to face you can't speak, you can't tell about your love. Open your heart into writing a few lines, and offer them to your 'some one.' It shall have effect.

You feel you are unjustly placed in life. Write against it. Voice your complaints in writing.

You feel that you may live long in this world, even after you have passed away from it. You tell your offspring to build a beautiful tomb over your grave. People will come to see your dome and not to think of you. You can live in another way—a noble and a more becoming way. Try to live in paper. What you write to-day shall live in paper very long into the mists of the future.

You think. You do! You have beautiful thoughts. You have shocking thoughts. Your head is thinking all the time. Why not tell us about what on earth you think? Tell about them through your pen. You will be known and admired. What you like best write about it. Whom you like write about him in good words. Whom you don't like write about him in bad words! Only do write!

Once you have caught hold of your pen, dipped nib in ink and left a coloured line behind you shall continue writing. Then you cannot do without writing. Have courage. Help yourself!

Rashid Ahmad.

LETTERS TO THE EDITOR

[We thank the readers for their being nicely critical—Ed.]

Sir,

Your editorial was a cutting satire upon those who deviate from the path of righteousness.

—Samin.

Sir,

You took the right way to offend us truants! —Alimi.

Sir,

Don't equivocate! You know equivocators are hanged by the divine law! —Equivocator.

Sir,

Good sense under the mask of nonsense! —Kanwal.

Sir,

Read your 'Christa' with fondness, but was disappointed to find no good denouement.

—Abul Fateh.

Sir,

I am impatiently waiting for the next short-story. Give us suspense and shock!

—Khalid Samir.

Sir,

A good attempt upon the life of Saadi by S. Akhtar! Why not Khayyam this time? —Malik.

Sir,

Al-Manar is going strong now. Keep the ball rolling!

—Saeed.

Searing Aloofness

BY

Rashid Ahmad

When cool puffs of night winds
waft about and about me
and soften and soothe me
and stray my loose locks;
then, "Stray O soul!"
whispers
my punished love
lost love!

When silent caravans of clouds
dipped and dubbed sanguine
in evening gloams
are scudded away before
winds
my silken flesh is red
burning in gloam
pining in pain.

And an urgrateful jibe
secret and remote is thrown
in my furrowed face,
"Could you be so dully
constant?"
And I scorn my soulful
tears.

When cool showers fall
from gentle heaven;
and drops thick and heavy
like my tears,
sift through lush green leaves
of trees, and smite
the leaves of grass
with a music that is sad;
that does not edify my spirit
and sears my soul.

I can't hear this music!
I can't see this scene!
I hide my face
against the wet bark of the
pine.
And create my own silent
music
of my profusely weeping soul.

And embers of distant memory
glow and blaze and burn
though fiercely cold they
were
under cold ashes of
chastised love.

Lush green leaves of grass
fresh and mellow and roral
bend and rise
on their jointless stems
and silhouette their
slender shoots on the cold
stones
drenched in evening dews.

I turn my face
away from such sights,
which I see alone,
forlorn and deserted.

I smile though with painful
shudders
at seeing waving nettles
over some greenless,
stone-less grave being
wreathed in moving
spirals of darkness.

5

STUDENT CLUBS

BY

Rashid Ahmad

It was in some casino, I recall that we young scholars were introduced to one another. How we gathered there at the same time is indeed surprising. To answer for it I may contend that men innately made of the same stuff flock together and settle at the same place.

The colours of feathers of such birds may be different, the sizes of minions of such flyers may vary, the voices of such beings may be high or low, sweet or harsh, bass or husky ; but one thing they love to share is the beating of their hearts ; they beat together. And they fly in a file. This line of theirs may be disturbed by storms and twisted like curls in a string but the invincibility of the line is there. The line does not break or disjoint.

Instead of weaving the students of this club into a necklace and throwing it so as to silhouette it, in background of white flesh of some stately neck or threading them into a file of herons thrown against the black clouds, I should, I feel, fish them out from their abysmal deeps and set them afloat on the surface.

So I push them out from the metaphorical mire in which they were sunk deep and hang them in the real touchable, airy world of ours.

One of them is Mr. Bulk. I call him 'one' for I don't want to put one at the head of the club and another at the tail. Everyone is equally great, active and explosive. They are convicts, all of them, accomplices in the same crime. So equal their servitude and punishment! I come to Mr. Bulk. He has highly flesh-coated frame. You apply a nail cut upon his skin ; a red crescent shall be embossed. He says he does not feel pain. He is Mr. Bulk. A handful of red flesh hangs under his chin. This mass of flesh is shaken when he opens his mouth to speak. He is Mr. Bulk. His eyes are big. He rolls the balls of them in their sockets with great skill. They roll when there is a flash of anger or a flash of love. Nobody can say if he is in a loving or an angry mood. One incurs his wrath when he is in love and wins his love when he is in a fit of blasphemous anger.

He says once he mounted the crag of love after wading through its foot of mire and mud. Now he felt giddy. Perhaps the rare and fresh air and the mudless top did not please him. He dragged his heavy feet and back down-hill, supporting them on his comparatively less heavy hands, and drew in and drew out many a breath of complacency when he lay at its foot of mud and splashed his heavy limbs about. He was happy, that old Mr. Bulk!

He longs to have back the days when he was a toddler (he showed me the picture of his childhood : a

afr... fleshy, football like slip-
...nod of a boy !) But when he sees a line of toddlers of his love prancing and frisking at his side his mouth is puckered with vicious smiles. And he at once dismisses his longing—foolish as he calls it!

Mr. Bulk has his own way of looking at life. This big way of his is philosophical. I laughed at him when once he opened his personal diary before me and pointed out to a line. It read: woman is a city. I wept over my folly of not having understood that abstruse sentence. Now I could speak on that sentence for hours and hours. Big philosophy indeed!

Another student of this club is Mr. Free. To begin with he is Stalin by moustache, Hitler by hair-do, a Hindu confectioner by whiskers and a Frenchman by beard.

He is a true admirer of Oscar Wild and Byron, a practical man in following the teachings of Godwin, a traveller in the way of Goldsmith and Stevenson, a talker in the fashion of Lewis Carrol and an intriguer like Siva Ji. If I am allowed a certain license of expression I may describe his physical assets. He has the head and face of an actor, rather a mimic, the waist of a ballerina, and the legs of a gout-stricken man. His bust is stiff and erect, his waist is facile and his legs rattle at the joints. In order to build up his body he has started having outings in the noons and resting in the mornings. He prefers the breath of stinking puddles to ozone-diffused air at sunrise!

His absent-mindedness and muddy-headedness is hailed in the club and vainly copied to merit his observation and esteem. So he loves coots and loves his friends should call him a coot, but he springs to his feet when the word silly is prefixed to coot. Nobody can call him a silly coot, but he overlooks it if called so over a cup of tea.

He will strike you a tipsy deuce at first sight or meeting. In fact he is far from it. A fiend he is, he confesses it, but not a drunk devil. He says his will-power is so strong that he gets inebriated by drinking one cup of hot green tea or a glass of hot college water.

He likes to hear tales about addicts but does not want to become one because he believes that "heard melodies are sweet........" He says that playing the addict is a fine art, like sculpture or painting.

The extent of his absentmindedness can be known from the fact that one day I heard him telling the reason of his coming late to College: he fell into a long conversation with a bone-eater whom he met on the way and was charmed by the peculiar twisting and wagging of its tail-end into a long long tete-e-tete which ultimately made him miss the first three periods.

Asked why he could feel it easier to talk to a member of the canine race than the human race, he contended that ancestors should be given preference.

He is a man of letters. But unluckily he has lost his aesthetic

taste in literature. He is conscious of it. Once a tea-chat was growing very passive. To make it active Mr. Free shook off his habitual sluggishness and worked his glib tongue into astonishing prating. His toe-lickers (he generally and condescendingly calls us his toe-lickers, because we take delight in lifting him to heights of egotism and cheap flattery) recommended the reading of some of his cream poetry. I give here some of it. I write this by feeding my mind upon the slight crumbs of my short memory.

He rolled his tongue in his mouth, wetting it with saliva and wheting its point he sallied:

Straying, useless dogs of these
streets,
Bestowed upon with a gift of
begging!

Now he rubbed his empty paunch and hurled a spoonful of tea down his slaked throat and resumed:

Their treasure is the curse of
the world,
And 'get-thee-gone' of the
whole world their earning!

No rest at night, no comfort
at dawn,
Dwelling in filth, sleeping in
drains!

Let some make them realise
their niggardliness:
Let some shake their sleeping
tails!

We hurled popular applause at Mr. Free. But he made this cutting remark, to our shame-facedness.

"I can't swim bravely against the this stream of pupular applause! Shut you up!"

We licked his toe. He showed his teeth in satisfaction. Hail Mr. Free!

Now another galley-bound convict is Mr. Smoke. Our polite way of addressing Mr. Smoke is: You are a man, Mr. Smoke! He smiles. He thinks that to be a man is all what life has for us in its store of respect, reputation and achievements. To be so is everything. He likes to be called a man not without any grounds. He owns that he struggles hard to rise from a vassal to a man. As he wishes to be a man, he pretends to be his own man. To achieve the fullness of his manhood he uses with command and cleverness novel ways, which to a man-in-the-street would seem normal, common; but to one who has sense and commonsense at that, these ways of his would seem to be smacking of pretence, vulgarity and snobbery. His smiles are coined ones. His laughs are monkeyed ones. His gestures are effeminate: as womanish they are sweet, as boyish they are unbecoming.

Our man Mr. Smoke is a chain-smoker. He smokes with vigour. He gives out thick spirals of smoke as if coming out of the fire-fed breast of a steam engine. His lust for cigarettes is confineless. His internal man must have become pitch-black. I wish he should have preferred the black-washing of his external man to

afe internal man. But he says that the inside is shut out from the public view, therefore it is advantageous to blacken it.

It was his first friend and of course his first foe who taught him to take smoke in instead of blowing it out. He puffs out little of what he pushes in. That first foe of his must have by now started being avenged in the form of gradual disuse of lungs, symptoms of which might in the near future be conspicuous in our man, Mr. Smoke.

At least there is some sweet truth in the philosophy of his bitter smoke. It keeps him in perpetual unconsciouness of his griefs, sorrows and fears, although here there is nobody who occasions him grief, there is nothing which causes him sorrow and there is nothing and nobody he is afraid of!

He loves the last remnant of a cigarette more than anything else, especially when its wave of heat and glow travel to his yellow finger-tips.

He says that a successful puff at the last bit of a cigarette is worth a smack of your love. Those who sneer at his philosophy he terms them as 'the ravishers of cigarettes' and a raped cigarette is the most pitiful sight in his eyes. May the whole smoke of all the cigarettes of the world remain chaste, modest! None should inhale it except men like our man Mr. Smoke. He can't bear to see beginners in the art of smoking overlook the etiquette of smoking. He has written a treatise on 'Smoking as a fine art'. He calls those vicious, sneering, ill-mannered, ill-bred who don't handle cigarettes nicely and carefully. He is over-nice in smoking and nicely critical of smokers.

I have purposely refrained from writing about the physical proportions of the students of this club. If I wrote about it, it would not make a delightful reading. You get it! However, I shall try a bit somewhere.

Another student of this club is Mr. Critic. Mr. Critic is of course a critic if by a critic we mean one who criticises and censures. But the amount o wisdom and intelligence in his head is far less than the amount of foolish evaluation of everything that comes under his eyes and under his feet, everything that is inside his head and outside it, everything that is near him and beyond the horizons. The thing may hide itself anywhere. Mr. Critic's eyes can't be escaped. His flaying is universal. He says his ancestors, too, to the vow of that age, were critics!

Mr. Critic is an incarnate critic!

Now criticism of our friend depends upon his own mood. If he is happy and you are unluckily engaged in a tirade against your elders, be cock-sure that Mr. Critic won't speak ill of you. You may even scold Mr. Critic. He would receive it as a compliment. If he is sophistically sad and you are unluckily in a jovial mood to praise a green linnet, a blushing flower,

a pretty face, be sure that Mr. Critic would at once inhale mouthfuls of critical smoke and blow them against you to make you and your 'green linnet,' your 'blushing flower,' and your 'pretty face,' all sooty and dirty.

Mr. Critic's form itself is of note. His face is scattered with many a tiny moat and many a wee top of a crag. These tiny tops look like small beacons lighting the way of puny yachts plying in those tiny moats. His face steals elfish light from the haunts of goblins and when you glance at his face you shall trace back your steps, not having the courage to fight so many of those goblins, expanding out of those tiny moats any flying down from those tops of tiny crags. Preter-natural Mr. Critic is! If his criticism does not scare you his spectral face shall goad you away. Such is our most unwanted Mr. Critic. Nerve up Mr. Critic! We still have courage to stand you and your criticism!

We love and hate each and the intensely. And we long that our posthumous skeletons should not crumble to dust but intertwine and dance to elfish tunes of under-world music!

Our club is a pandemonium, to be true and sure. We are mighty busy in our minds and actions. We work feverishly like great men. Ours is a rendezvous where we come and go, where we fight and reconcile, where we talk and prate, where we are decent and indecent. We do what our boyish innocence incites us to.

We know this rendezvous shall be deserted after a decade or so. We don't think after us gentlemen would frequent this meeting-place of ours but our heart and humour foretell us that vulpine and canine races shall make this rendezvous their dungeons and kennels! No good club. Sure?

DEITY'S OBLATION

BY

Rashid Ahmad

The flowers and foliage of your abode the winds have blown away.

I was driving the speeding car. My driver was on the back seat. That evening I was accidentally at the wheel. Else my driver always drives.

My nature is that of a passionate man. A passionate man in time of danger acts more dangerously. He becomes aware of his scurry and hurry when he has incurred some loss or come to grief.

That fateful evening I was at the wheel. That fashinable part of the hilly town is always full of traffic. You have to elbow your way out through such a flood of traffic. Doubtless I was driving with scrupulous care when a beggar-girl tried to cross the road from before my speeding car. I thought she would easily cross the road before I would, God forbid, run over her frame. But my thought was vain. I gave the alarm, shrieked, but in vain. The helpless girl was struck down by the speeding wheels of the car. I went out of breath. The people gathered around my car like a swarm of bees on honey. But none of those stone-faced creatures lent a helping hand. I with the aid of my driver lifted the girl from the road, put her in the car and sped away to my residence.

The moment I reached my study I rang up the doctor, and hurried back to the injured girl. After a few minutes the doctor turned up. He examined the girl, applied the bandages, poured a few drops of medicine down her throat, expressed, to our relief, satisfaction over her condition, and giving us a few instructions, departed.

The doctor's poor but consoling words shook off the haze, tumult and medley of thoughts that had heaped up in my head. I had arisen from confusion-drunk Asar to Asar the sober.

I stored full in the face of the beggar, a poor waif. A stare, a gaze had a miraculous impact upon my mind and a mighty sea of retrospect was afloat around me. It was a sea of past where turbulent rapids of tears rolled under surges of sunshine smiles; it was peaceful sometimes, sometimes it was free and wild. My petrified stare met her big, hazel, opening eyes. She had flung back the fluffy, silken, soft blinds of sound sleep and was furtively peeping through a parting of them. Lifting her long eye-lashes that gave a cool shade to her gleaming orbs she hastily glanced at all round her and then again fixed her

eyes upon my face. Her solemn, sad, and sorrowful eyes seemed to search something in my face that was perplexing. With the soft, purging glow of her eyes my whole benumbed frame was thawed to lively warmth, and I becoming aware of some danger at hand prepared to rise, when she lifted her head, stretched her hands towards me, and opened her mouth to rap out some words. I was sweetly uneasy with a delightful aching in body and soul. I hushed her with a gesture of my hand and left her in a confused hurry.

How by some circumstantial freak of Fate presentiments and presages are fashioned into reality ! I was thinking of this accident. It led me to dwell upon the retrospective perspectives of the past.

The girl, Sarah by name, came of well-to-do parents. Her father was a competent doctor of the town. She had all the comforts of life that the rich boast of and the poor wistfully dream of. She lived in our locality. Childhood rolled by like a dream that is broken in its wake. Our childhood was full of laughter and sunshine. But as we advance in age and step from calm childhood into noisy adolescence we want our lives to be eventful, violent, and perhaps fateful and direful too. We secretly mourn our boyish or girlish loneliness and keenly wish someone to share the noise or silence of our lives.

Before our lives met and were offered a mutual introduction by the echoes of our hearts and the mute language of our eyes I had heard that Sarah received a billet doux from a young soldier, who had come to spend his leave in our town. This amorous affair was exposed to her parents and others. They say that love and theft never escape exposition. She was chastised and ordered not to go to her school through the street in which the soldier's house was situated.

As a consequence of this incident her filial piety and love which she had incarnated in her flesh and cherished for her parents turned into a sort of vindictive hatred for them. Their parental affection and protection was tossed behind a mask of callousness, indifference and strenuousness. This only to check her advancement into vast, black vacuums of sin and impeachable shame. But this caution overlooked the sensibilities of a passionate girlhood.

But how long can a tigress, a young tigress, be caged? How long can the youthful, lavish spirits of a passionate girl be curbed? You can pare off the rudeness, waywardness and vivacity of a youth into a paragon of submissive, moderate life but the restless, fiery soul within breaks down all barriers of check, admonition and reprimand. You try to press her back but she would doubtless wax forward. Outside check fails. The only means most judicious to adopt at this juncture are to let the young hearts act as their minds lead them.

It was in this moody frame of mind that I, one wet evening, now

and then reddened by the gloam that played hide and seek with the scattered specks of clouds, dwelt upon my being alone, fearfully alone amid this vast sea of noisy life I saw the hidden twilight sometimes, and sometimes the sailing clouds. Only a few swallows seemed to happily feast upon this beautifully painted panorama of Nature

With the advancement of night darkness hangs as a pall over lonely hearts. As darkness of night waxes black, notion of loneliness goes deeper into the soul. And the helplessness of our solitary soul lingers, on, so much so that it begins to vent itself in tears—helpless evidences of a burning grief. Then cool winds that blow don't cool but fan our burning eyes, burning cheeks, burning lineaments and burning breasts ablaze.

Hateful, spiteful of this humming world I rose and wanted to cast a farewell glance upon the departing redness of the gloam, when a figure like the silhouette of a figure under a dark sycamore appeared on the garret of the house opposite to that of mine. The figure statued its face upon me. Happinesses, nay ecstasies, were ours.

This way our attachment embarked upon hopes of nuptial seas, before we could think of a check to the sneering detractors and ill-wishers who weave malicious figments from their deuced minds. Two hearts once united think that they are united for all times to come. They never think that the calm seas they are adrift upon are also visited by fearful rapids that may dash them to pieces.

I knew that Sarah had been, before my attachment to her, given a bad name. But I never wanted to repulse the arms that were advanced to me in the hope of getting sympathetic love from me. I gave sympathy, I gave love. I made her my princess, I made her my deity, and adored her like a sincere and faithful worshipper.

The walls she used to deck with the roses, tulips and lilies of her marmoreal arms, of her aphrodisian bust, of her chaste face, of her chestnut tresses, were now haunted by the spectral sights, hallucinations, and black vultures.

What usually happens in platonic love happened in our case—Frustration.

The rose-garlands I used to send her withered. She sprinkled water over them to keep them fresh. They revived. But how long? Withered, dried up, fallen and then reduced to dust.

I had to leave her. She had to bid her adieu—severed as I already was.

I had finished my studies. And finally I left her, her lane, her town. I left her to grieve.

Despite my great efforts I could not shake off her memory. One who is true in love cannot simply conceive the idea of a long-lived separation from the object of one's adoration. But to pretend to dress my wounds I thought, rather believed, that she

had gone far away in search of her cherished flowers.

Days and nights somehow wore off. My life too wore away.

After a long, painful silence I came to know that her hand had, in marriage, been given to a man who was of a dubious character and below her expectations and hopes. How easily fate disposes of our dear hopes! He was not the man of her dreams. Her parents did not know this. Perhaps they had not been young or perhaps they had not any hopes, any dreams, any likes!

I prayed and was saddened. I waited and supplicated for clemency. Yet I conquered one thing. I could be peaceful by remembering her. To me it seemed that flesh had been pressed under dust. Soul soared in heavens. I was silently and thoughtfully wearing of my life like a hermit in a sylvan chalet when that evening this incident took place and it ripped up the painful past.

My presentiments and presages to see her and own her and offer her my oblation became bright and at last were, it seemed then, crowned with success. I was indescribably happy that Sarah was in my house. Yet I was afraid of the world. I had before that been wronged by it. So I wanted to take every step with utmost care lest I should have a fall this time never to get up.

The night had come. I called a servant to ask about her.

'She is quite well,' he exaggerated.

"Is she sad," sad I, "or happy?"

"She is very happy, Sir."

"How do you know this?"

"Her face and talk show it."

I was satisfied with her condition. The servant pondered a little and then broke in:

"Sir, she asks when will you go to see her. And perhaps she knows you too. She says she has met you some time before this accident."

To stop the servant from further talk and to stop myself from betraying any swelling emotions I bade him go, take care of her, and tell her that I would see her in the morning. The servant walked off.

I muffled myself in the blanket and was soon being caressed by the 'downy' lily-soft hand of sweet sleep.

That night I had a sound sleep. No dream disturbed me. I rose when the dawn broke. I had to go to my office. I mocassined up my feat as the place I was living in was a mountainous one, and there was snow and snow everywhere. I went to the beggar-girl's room. The first thing I did was to get hold of her wallet, a piece of cloth, and a stick. I put them in a safe place and then went up to her side.

She was asleep. I did not like to pick her up. I was on the point of retracing my steps when she opened her eyes and called me out in a subdued voice: "My Asar! Are you Asar or is it a wraith-like sight? Come to me. You stand

afar. Am I not known to you? Am I nothing to you? My dearest heart, I have had odd days and sad nights. I have been so miserable and helpless that even dogs were scared by my shadow. I wept and cried for you..... . but no reply." Her eyes were wet.

"Sarah! I am with you. You can feel me. I always thought of you You are my deity. How can a worshipper forget his deity easily? When we had bad times I pined to see you, to talk with you for a second. Now time is ours. We would sit hours and hours and pour out our hearts before each other."

"Asar! I wish you could listen to my sad story—all of it. It is terrible. If another than myself had been in my place, she would have liked to jump into fire rather than to accept patiently the type of life I led. I lived in hope. Hope kept up my nerves. Hope sustained me. I was sure to find you. I bore all the cruelties, wrongs and infamies of life but never ceased hoping to see you. It is ten years past since I was snatched from you by cruel destiny."

I had in fact no strength in me to listen to her woeful tale. I could not overcome the fullness of my emotions which were expressing themselves in tears. I hastily wiped them and begged her to keep silent.

"Sarah! you would be healthy again within a few days. I have asked the doctor to pay you a visit once a day. Tell him about your difficulties. I now am going to my office. I shall be with you after a few hours. In the meanwhile I shall place a few pictorials before you. Enjoy yourself with them. Well, agreed?"

"Yes, please come back soon. I shall wait."

After filling her lap with some magazines and pictures I left her and went to the office. I sat in the chair for an hour, complained of indisposition and returned to my residence.

I thought I should not go to her as she was unwell. I should avoid her, I thought, else her overflowing emotions would affect her badly. "Let me not frequently see her. But after she is strong enough to leave her bed and have outings with me I would listen to her; I would listen all about her." I taught myself to be peaceful in this way.

For five or six days I kept away from her. I went to her only when I was badly needed, when she could not bear to be alone in her sick-chamber. In this interval she had recovered her youthful colour and spirits.

One evening it was the most glorious sunset that I ever beheld. Twilight redness was making charming red patches on the newly-fallen white snow which had covered the depressions and elevations of the earth like wave-impressions on sand after the flood has abated. Sundry thorny plants danced a waltz with the evening winds and their slender willowy stems reflected serpentine silhouettes down in the liquid snow,

thawed by the warmth of the evening gloam, to splashing water. A few green birds flew about, near the snow, near the plants covered with snow. In this romantic atmosphere it is a natural desire of the wineful youth to have their heart-throbs near them. I wished so fearfully so!

I had dreamt of the moon with its cool bluish-white light descending upon me to cool the hot embers of my breast. The absurdity of such a dream had mocked me. But now the whole light was showering upon me. I could see it, bathe in its light, feel it and taste it, absorb its beams with my eyes and lips.

"Asar! Asar!" a deep painful voice was wandering about and about my study, like sounds heard in dreams but broken in their wake. Sarah was, with faltering steps, advancing into my study. A grim fear seized me—lest she should fall. I propped her and motioned her to an arm-chair into which she sank like a linnet in its nest. With panting breath she complained, "There was no one about me. All are gone somewhere. I called them each by name. Nobody answered, nobody turned up. Vague forms began haunting me from all nooks and corners. I called you. My voice only got back an empty echo, which made me start. I got up and came here in search of you, and now I am peaceful to find myself near you."

"Are your better, Sarah?"

"Asar! neglecting my question she chimed in, "why do you flinch back from me? You come to me very seldom, as if my presence appals you."

"Sarah sweet! please do not say so. Every fibre of my being has been silently but painfully adoring you. My greatest ambition in the world has been to see you happy and make your happiness."

After a pause I asked, "Can you now walk without strain or pain?"

"I can with ease."

"Will you like to have a walk with me? Come on. I will prop you."

I helped her put on shoes and a woollen over-coat. Supporting her I came out and fell on a track leading up to a small hill whose top was capped with snow. There was snow all around us. Now dusk and gloam were in a tussle, dusk blanketing the gloamed horizon.

"You promised me to tell your story. Keep back nothing from me. Tell me all that befell you since we two parted."

"Listen dear!" she began with a deep sigh as if she did not like to rip up old memories of her sad past.

"When I lost your sight I lost my happiness, and my comfort and my patience. I killed my anguish by weaving garlands of tears in my solitary study. Books and pictures did not delight me. I was sick at heart. Everything around seemed a dreary, black, waste."

"My parents gave me little love. I cursed my lot for having been born without brotherly or sisterly affection. People's flouts pinched me and intensified my grief.

"You know I was just going to complete my school education when my parents deprived me of further schooling. The little comfortable noise that I heard from my school companions was also denied to me. In fact the whole charm of my life was dead.

"These sufferings had not been relieved when another bolt fell from the blue. My engagement was announced. I bit my lips and ground my teeth. I apprised them of the ruin of my future life. I protested to them in the name of everything dear to them. But they were inexorably bound to seal my fate with complete wreck of my life. I bore all this.

"And then the day came when my hands were reddened with myrtle leaves. I laughed with my parents hollow empty, dry laughs. I hid my chagrin in my wounded breast. I scorned society by inflicting the lash of pain upon myself. Helplessness is avenged in this way."

She was boiling with emotion. Lines of deep scorn and deep grief were embossed in her face that was growing blushingly milky. She lifted her black wet eye-lashes and seeing me too tear-bedimmed, dropped them down.

A cold wild wind was wafting a snowy breath down the slope we were ascending. The hill top was only at a stone's throw. It was not very far from my residence. I held her and requested her to rest a while. She stopped for a few minutes and then bending with a hand on my shoulder asked me to press on. We were again traversing the track with a snail's speed. She resumed her story.

"My flesh crept and writhed with pain when my new master faced me. Willy-nilly I had to live under his frown and rod. He traded in hides and thus filled the house with the odour of them. He himself kept out of doors with his friends. He would come at night with his filthy friends and compelled me to serve them before his eyes. His mother, of a vulpine nature, chid me daily and even menaced to beat me if I refused to do all the servile duties of the household, from washing rags to throwing out night-soil. Hands accustomed to holding flowers now held thorns. I protested but was rebuffed with chastisement. They were not men. Wolves they were Clemency they had not known.

"One night I asked my hateful spouse to keep a servant as I could not do all the heavy jobs single-handed."

"He said: 'You know how to lay traps for young men but do not know how to discharge your household duties. I can dispense with you any time, and I would if you do not mend yourself.'

"This broke my heart. He had known our affair. He had

wedded me only to use me as a niggardly maid-servant.

"One day I picked up a quarrel with his sneering mother, who, when he came home, told him about it. He flew into a rage and thrashed me like an animal, and pushed me out of the door. I clung to the threshold, but the door was closed. It strained and bled my fingers. I became a homeless wretch, going where I did not know, coming from I tried to forget.

"Like a waif I walked the cold roads and hot roads; under benumbing showers and scorching sun. I had nothing. I took myself and my hope which I dearly kept in my lacerated bosom. I met vicious looks, loving looks, crafty looks and sympathetic looks. I defied all. All I had was a priceless treasure of hope.

"I dipped dry crumbs of bread in water and swallowed them. They tasted bitter. I muffled my body in tattered clothes. Cold and heat still penetrated. I slept in storms. Never did I know sound sleep. With sleepful eyes I left my dusty bed and dragged my staggering limping life behind me in hope sometimes, sometimes in hope again.

"And those long ten years of sadness and pain were put to an end by you—my saviour."

"Oh! Sarah! you afflicted soul. Now we shall start our lives afresh and anew. Pain shall give way to pleasure. We will dwell there till we die happily."

By this time we had mounted the hill and were sitting on its top. Its top overlooked a steep trench and in the background were snow-clad mountains and green groves of pine and cedar in the vales. The shades of night were falling fast. A hushed silence was taking possession of the surroundings.

"Asar, have you married or not?"

"Have you seen my spouse?"

She smiled in return.

"I am not married but despite my constant appeals to remain celibate for another year my parents have betrothed me to a cousin of mine. This does not mean that I can't break off this engagement. I can easily do that. Let not your mind be haunted by any shade of doubt."

"You will have to fight your parents for my sake. You will be deprived of their parental affection."

"I shall straighten out things. Why do you worry?"

"Your fiancee is highly educated, eh?"

"Yes, but does it matter?"

"She might be dearly loving you, like me. It is so very much queer to think so!"

"But all that I have or is mine is yours. My love does not stand divided. All my love is for you."

"I don't want to ruin her life. She might be like myself. If she does not get one whom she loves her life would lie at stake. No, not so. How can a vagrant, gypsy girl usurp the right of an elegant, educated and loving lady?"

"Sarah, why do you think so? It pains me to hear such words from you."

"I was born ill-starred. I am a sinner. I don't want others to stand on the verge of sinning and ruining their lives like me. Why? It matters little if this world is rid of a lonely and sinning soul. Before I could place my hand on her mouth and seize her she had rolled herself into the deep trench below. A shriek and nothing more. Treacherous calm pervaded the universe.

"When sorrows come, they come not single spies; they come in battalions."

All that I could say was to summon inexorable death. All that I had were her wallet, the piece of cloth and the stick—mute tokens of a destitute soul!

OBITUARY

Every eye was wet and every heart bled when the body of Nazir Ahmad Rahmani, the dear father of our dear departed teacher, Saeed Ahmad Rahmani was being pressed under earth. Even the rugged and dusky hills of Rabwah wore a melancholy and mournful look.

The mists of future will dare not dim the picture of this man of God, that is deeply imprinted in every feeling heart.

We feel the grief that fell to the lot of the bereaved. May his soul rest in peace!

Creation of a Piece of Art

(Original poem by Agha Shaheen)

BY

Zafar Muhmud, IV Year

I, sitting on the tumbled down
building of time,
On the white sky of paper,
Am shaping stars
Dim, dead and vague.
Who is she!
Coming towards me,
Turning and turning
On this winding milky way,
With silent steps on the stairs
of moments
Slowly and steadily
With feet delicate.
And the sound of her footfall
soft
On memory's track,
Sounds like music soft.
Or like the tinkling of little bells,
Or the dropping on the grass,
From the fluttering flowers,
Of the coloured petals
Or the tickling of the drowsy
dew-drops
From the lips of the untouched
Rose-bud.
Or———?
Or———?
Or———?
What sort of sound?
Who knows?
But a vague and intoxicating
sound,
Slowly and slowly
Is stealing upon my mind
What is this stirring in the sky-
white universe of mine.
These tales
That died to the ashes and
were buried in my files and
books.
How have they come to life!
Why on the lips of Man's Pen,
In the grip of my shivering
callous hands
A smile has frozen.
And through the window of
mind.
In a clump of trees
Dandling swings I behold
And in them I see,
Maidens steeped in rain
With raven hair.
On their well-shaped shoul-
ders
On their heaving breasts
Dishevelled and flying in the
air,
Singing a sweet melodious
Malhar.
'Who are they?' I ask.
And a maddening voice says:
Thou fool!
They art thy virgin stories
Which thou hast not yet decora-
ted in bridal costume
On the soft milky bed of paper.
The crimson blood of time
Running in the veins of universe
Is boiling like red hot lava.
And a hollow circle of light
Is spreading
Enveloping everything in sight.
And the sound of her foot
falls soft
Is stealing upon my mind
From all around

The College Bell

BY

Kalim Ullah Khan, III Year

You all are surely submerged in a fathomless ocean of misunderstanding. You have gone astray by thinking that I do not control the affairs of your college, whereas I do. I pray you to read me with proper attention. Be clear-headed. It is I, the cause of this hurly burly, and hustle and bustle in your College. Don't take me, for God's sake, as an ordinary cheap circular piece of bell-metal. It is not exaggeration to say that you all are my slaves and that I am your master. Come out with true words; is it not I who make you leave your beds early against your wishes? Can you dare deny that it is I who impel you to run to your College in confusion and perplexity? Can the basket-ball players refute this very fact that it is I who make them to present themselves in the ground to Hon. Khan Sahib in the 1st period, and let them not to be called lazy and sluggish? Just think, is it not I who wake you from your sleep?

Frankly speaking, I make your time-table and programmes successful. I teach you punctuality, I regulate your habits. I have got the supreme power, for I control all your movements in the College. You—one and all—obey me and respect me more than anybody else in this College. Bravo! What a nice lesson of obedience I have taught you, for when I call you, you come running to me, sometimes panting and perspiring. You all are subservient to my wishes and desires. When I take rest you, too, take rest. When I am in action, you have to be in action. Don't consider me as stone-hearted by just looking at my body. Is it not compassionate on my part that I let you take rest on Friday, all the day long? But on other days I take away your liberty and keep you under strict control.

Here, I'm kind enough to provide you ample opportunity to speak out if my militancy or restriction have gone to the extremes. You are happy when I send you back to your homes.

I give you happy and sad occassions. I give you variety, I give you change.

Learn carefully what I teach you "PUNCTUALITY"—otherwise you will repent throughout your life. You have been warned once for all.

AFRICA

BY

Jafar Msolomi, I Year

The African case is the biggest criminal and civil case on earth. Unfortunately it has never been referred to The Hague. If it were, the Africans would win, while the colonial powers would lose. So, none of these latter would have the case sent there. Rather they would say: "These are internal affairs. They are not international!"

The case is criminal because there is robbery. It is also civil because we know the robber is a gentleman, but he just cannot take the courage of giving us back our birthright when we want it.

Yet when some of our leaders said this they were charged and detained indefinitely. Some of them were accused of communism. We all know that the African soil is naturally unfertile for the communism plant to grow. After all why should any people raise a hue and cry when we say that we want our independence?

Freedom and national independence are our birthright. Yet some nations came to Africa in their "scramble", cleverly or forcefully deprived us of our right and stored it in their own colonial offices.

Now we have no voice. Somebody sits in an office somewhere far away. He just decides what we should and what we should not do, which is much too often the wrong thing. Moreover, through his dictatorial agents, menacingly posted in different parts of our countries, he would present to the outside world hideous fallacies about our countries.

We hate being regarded like so many children. We are men and women like other men and women of the world. But of the 200,000,000 (two hundred million) Africans only about one-third are regarded as such, the rest are still second or even third class people in our own lands. Our brethren in South Africa, under Apert—, are still regarded as "cutters of wood and drawers of water".

Of the total area of the continent, 11,260,000 sq. miles, it is surprising to note that there is land known as "part and parcel" of some European country. Much of the rest is still federation, protectorate, trust territory or colony, and each of these means almost the same thing. It means that a few Europeans dominate the African masses.

These Europeans, headed by a governor, are both rulers, and civil servants. The governor is the absolute ruler whose word is law. Sometimes the Asians get a second place, while the Africans are placed in the rear.

Now I am going to describe Tanganyika, a typical British Trust Territory, whose pure African nationalism and full cooperation between the different peoples, has reached such a pitch that any further delay in the people's independence may make them fall "in shallows and in miseries." Divide-and-rule policy has been crushed down to its very basement by the will of the people themselves.

But this is another story. I would ask you to look at the following few and simple facts, and you will probably realise the importance of Africa in the world.

Plenty of land is still available for agricultural development. Africa produces *inter alia*, 98% of world diamonds; 55% of world gold; 22% of its copper, 2/3 of its cocoa, 3/5 of its palm oil. Such strategic minerals as manganese, chromium, and uranium are abundant. The vast natural forests, rivers and the great lakes, provide potential means for development. Practically there is no plant in the world that cannot grow in Africa.

What blessings!

MALARIA

BY
Mirza Nasir Ahmad, II Year

Malaria is a very dangerous and wide-spreading disease. It takes a heavy toll of life and millions of people fall victims to it every year. There are millions who escape death, but are poisoned and weakened by the disease. The symptoms are unfortunately too well-known to need any description. Practically every one in this country has had an attack of malarial fever, and has experienced for himself the chill and the shaking of the body which mark the onset of the attack. The rise of temperature (I mean the fever), is succeeded by the perspiration stage, in which the body perspires freely, the temperature comes down to the normal or even below the normal, and the person has apparently got rid of the fever. But again he is subjected to subsequent attacks, unless remedial measures are adopted. The disease came to be called Malaria, as it was formerly supposed to be due to the effect of bad air as it is evident from its name (Italian: mala, bad, *aria*, air). It, first of all, broke out near the marshy places where the ponds of stagnant water abound after the rains. But it is now definitely known to be caused by the existence of a small unicellular microscopical parasite in the human blood.

Before going ahead, I would like to explain the word 'parasite' and 'host.' Parasites are those small poorly developed organisms which cannot lead their lives as independent individuals and are unable to prepare their own food. Consequently to exist they have to depend upon the prepared food of some other organism or upon that organism itself. These organisms are said to be their hosts. In case of malarial parasites their hosts are the man, and the female mosquito of the genus Anopheles. In man the parasites live in red blood corpuscles, which are introduced by the bite of the particular mosquito mentioned above.

As soon as these parasites are introduced into the human blood, they find their way into the red blood corpuscles. Then each parasite feeds upon the haemoglobin —a proteinous substance in the red blood corpuscle, and grows enormously in size, and ultimately destroys the whole blood corpuscle. At this stage it is called 'Trophozoite', when full grown, trophozoite is spherical, and almost as large as the corpuscle and proceeds to divide by a process of multiple fission known as 'sehizogomy'. The nucleus divides into a number of nuclei, which come to the surface, and its protoplasm—a living substance which is the essential part, of the all living organisms, constricts round these daughter nuclei to form a rosette of smaller parasites called the 'merozoites' surrounding the unused parts of parasite which contain all the pigment granules.

The enfeebled blood corpuscle can resist no longer and breaks up. The merozoits thus formed are set free in the blood stream and enter as many uninfected corpuscles, become tropnozoites, develop into shizonts and undergo the multiple fission for several times.

It must be borne in mind, that when first introduced, the number of parasites is small and no inconvenience is caused to the host (the man harbouring them in his blood). For about ten days this schizogonous multiplication goes on, till the number of infected corpuscles become so large that on their breaking up toxic products—poisonous bits of protoplasm of the parasite, are set free in a very large quantity in the blood, which cause a sudden attack of fever. After the first attack of fever there are successive attacks at each period of merozoites formation, which may be 'tertian'—which returns after every forty-eight hours or may be 'quartan' whose attacks are due after every seventy-two hours, depending upon the species of the parasites. These parasites belong to the genus plasmodium.

By repeated schyzogony, the number of parasites increase in a geometrical progression, until a very large number of corpuscles are destroyed. There are also present in the blood another type of corpuscles —white blood corpuscles (Leucocytes). They act as anti-malarial corpuscles and kill the merozoites where they find them. A man possessing a good health, has had these Leucocytes in abundance. So he can easily get rid of this disease. To the contrary an unhealthy person, lacking these corpuscles, is an easy victim to these plasmodia. If this parasite increases to a certain limit and has destroyed almost all the blood corpuscles, the patient is liable to die.

From the evidence of the statement mentioned above it is obvious that if a malarial patient is not treated properly, and the merozoite formation remains unchecked, there would be an end to his life. So it is our first and foremost duty to take such steps that would make this disease uneffective by destroying the parasites in blood by anti-malarial drugs.

The problem of effectively dealing with malaria is a great national problem of our country. The reader who has acquainted himself with the life-cycle of the malarial parasites, should feel interested to know the general principles on which all preventive measures are based, and when the circumstances arise he must be prepared to fight against malaria. A few preventive measures are as follows :

(1) To kill the mosquitoes in all stages of development, by spraying D. D. T in the corners of the rooms of his house or by pouring kerosene oil over the surface of the stagnant waters.

(2) To save himself from being bitten by the mosquito.

(3) To use anti-malarial drugs such as quinine, palodrine, atabrin etc.

(4) To keep his health good, so that he may not become an easy victim to the parasites.

PEACE AND ISLAM

BY

Saleem Akhtar, IV Year

I have often thought over the problem of life in my vacant time, and I have reached the conclusion that to live is not an easy thing. Though, today, I am not facing the practical life in its real sense even then I can just visualise the vast and awful sea of life. Then my nature asks me questions strange and sometimes painful. Human nature is curious and it tries to know what is unknown, conquer what is invincible and to feel what is impalpable. History stands as a witness to this statement. This courage to know and zest to solve the enigmas of our life has brought the human generation to the shores of modern civilization. Modern inventions and discoveries are practical interpretations of those dreams which our glorious ancestors are reported to have seen. Now we must review the whole situation and see to what an extent we have been successful in our aim.

But the present general unrest in the world atmosphere indicates the absence of something essential and vital. Despite so many inventions and amenities of life man seems perturbed. Man's eyes are wandering in bewilderment and in search of something which he does not know how to achieve and retain and that is peace of mind. Yes, they demand something which should give them peace of mind; which should ensure their peaceful existence and which should make them more hopeful about the peaceful progress of their children. The existence of regional defensive facts is a living testimony of the fact that humanity has lost all hopes of peaceful co-existence and nothing can save it from utter destruction. They have lost confidence even in themselves. International cold-war is the result of the lust of acquiring more and more and there is no end to this. This thing had been foretold by the Almighty centuries ago in His Holy Book:

> "Do not lift thy eyes to those material benefits which we have bestowed upon other nations in order to try them in their actions. That which thy Lord has bestowed on thee is best for thee and most enduring."
> —(Tauba verse: 131)

The present age may rightly be called the age of economic struggles. The struggle for existence has been more intensified with the division of wealth between different nations. The wealthy and economically well-placed nations have become more greedy and in this way the Almighty is trying them in their actions.

There are two well-known economic-blocs, *i.e.*, Capitalist and Communist. The cold war going

on between these two blocs is the result of the lust for power and wealth.

Another course of the present atomosphere of uncertainty and cold war is the mutual hatred and fear which the two blocs have for each other. None of the antagonists is just to the other. This thing has also been pointed out very clearly in the Holy Quran:

> "O believer, act uprightly in all matters for the sake of God, and deal equitably with peoples; let not hatred of people incite you to injustice. Do justice, for that is in accord with righteousness. Make God your shield, He is well aware of what you do." —(*Al-maida* verse-8).

If these things are given their due place and importance no international dispute can remain unsolved. In the international relationships humanity has failed. Modern inventions have done no good to humanity. Inventions of rockets and guided-missiles have helped the cruel hands of tyranny and injustice and accelerated the speed of mass slaughter. The proverb 'right is might' belongs to past ages, today 'might is right' is more in keeping with the international developments.

The idea of national superiority is another cause of international restlessness. Hitler made his own philosophy and said that Germans belonged to a superior race and therefore they had a right to rule the other nations. The racial segregation and colour discrimination are the conspicuous signs of this feeling of national superiority.

The Holy Quran in this connection says:

> "Let not a people despise another, haply the latter may turn out to be better than the former." (*Al-Hujrat* verse-11)

Man has made great material progress and no one can deny the fact that sicentific advancement has reached the zenith of glory; but on the other hand humanity has failed to pay any attention to the soul. Now man has begun to feel that there is something missing. What is that?

Up to this time the so-called civilized men have been ignoring the importance of soul; but now they have begun to feel it very strongly. It has become impossible for man to ignore his soul any longer. The importance of the soul and of the nourishment of the spirit is being realised. Wordsworth says:

> "The world is too much with us; late and soon;
> Getting and spending, we lay waste our powers."

At another place while addressing Milton he says;

> "We are selfish men:
> Oh! raise us up, return to us again:
> And give us manners, virtue, freedom, power."

So the stagnant water of diseased souls has filled the atmosphere of this world with pungent smell. The venomous water of this earthly pond has destroyed the beauty of

the heavenly flower, *i.e.* soul. Though the flower of our life has flourished and its colourful petals are pleasing to our eyes but it is an irony of nature that the flower is devoid of any fragrance to sweeten our gentle feelings. This thirst of man cannot be quenched by earthly water. The soul belongs to Heaven and its thirst can only be quenched by heavenly water. The Promised Messiah has brought that water from Heaven for this age.

"I am that water which has descended from Heaven in time."

Industrial Problems of Pakistan

BY

Abdul Sami, IV Year

(The author is thankful to the writers from whom he has taken a lot—Ed)

Many deep studies in the field of industry have proved beyond all doubt that even Western Europe and the U.S.A., in spite of all their technical acumen, are still labouring under the weight of countless problems of labour management, high labour turnover, absenteeism and the like. In fact, in ourcase, we switched over completely to industrialisation, these and other similar problems would confront us. In fact, in our case, things will be still worse for the reason that we yet do not have enough industrial experts to guide us and to tackle these problems. What will still further complicate things is that the industrialist in this country is hardly the open-minded and enlightened individual that he is elsewhere ; he is obsessed with the desire for quick gains.

The real secret of every industrial country's prosperity depends on two factors ; high production and low cost. Unless the two factors are seriously considered both by the industrialist and the State, the adverse result would weigh heavily on the country undertaking industrialisation. The present inadequacy in the industrial sector in Pakistan, in spite of innumerable factors, is a result of this short-sightedness. Unless we educate the industrialist in the light of modern researches on the subject and do away with the entire out-moded, unsatisfactory system adhered to at present, we cannot keep pace with with the progressive world. Let us, for instance, take the textile industry, one of our major industries, and find out the reason of its failure in competing with foreign producers, although labour and raw material are cheaper in our country than anywhere else. But labour is not efficient, lack of trained and experienced workers is the cause of its failure in the market. Another factor is withdrawal of controls in early 1958, the textile mills concentrated on production of fine varieties of cloth which fetched attractive premium over coarse varieties in the home market. This shift of emphasis interfered with exports. In order to connect the situation a number of measures were taken. Controls on the production of both cotton yarns and cloth were re-imposed with effect from 30th July, 1958. Price control, too, was reimposed on September 24, 1958. At the same time mills were directed to work three shifts per day in order to increase the exportable surplus. During the quarter of January March, 1959 to exports of cotton manufactures rose sharply to Rs. 2·26 crores from Rs. 0·94 crores in the quarter October to December 1958. In spite of all these efforts, competition is very strong.

Now the question arises as to what are the causes of the industrial backwardness of our country ? To answer this question it is better to have a peep into the pre-partition conditions. The sub-continent of India was one of the leading industrial countries of the world in the past. As the Industrial Commission of 1918 observed : "At a time when Western Europe, the birth-place of the modern industrial system, was inhabited by uncivilized tribes, India was famous for the wealth of her rulers and for the high article skill of her craftsmen. And even at a much later period, when the mercantile adventures from the West made their first appearance in India, the industrial development of this country was, at any rate, not inferior to that of the more advanced European nations."

Even at the time of partition many important industries were present in undivided India. The important among them were cotton, jute, sugar, cement, iron and steel, paper, glass, chemicals, matches, tobacco and glass. As a result of the partition of the sub-continent all the basic industries went to India and only a small share fell to Pakistan. Out of 1063 factories of major industries only 50 were present in Pakistan.

Another fact that indicates the industrial backwardness of Pakistan is that out of the eighty-seven kinds of industries listed in the official, publication, *Industrial Establishment in India* for 1945, as many as twenty-seven were entirely absent in Pakistani areas. Among these were such industries as jute, iron and steel, ship-building, paper and paper pulp, dyeing and bleaching industries, etc.

Now I will give the causes of the decay of our handicrafts and industrial backwardness of Pakistan.

(1) *The Policy of the East India Company.* India in the eighteenth century was a great manufacturing as well as a great agricultural country and she supported the markets of Asia and Europe. The East India Co. and the British Parliament followed the selfish commercial policy. The Indian industries were discouraged and English goods were imported to India free of duty or on payment a of nominal duty. The effect of this selfish policy is still visible in our industries.

(2) *Growth of Railways.* The development of railways also injured the interests of the Indo-Pakistan industry. Local industries were discouraged and the skilled and particular kind of labour began to shift.

(3) *Industrial. Revolution.* In this respect it is sufficient to say that the invention of the powe-rloom in Europe completed the decline of Indo-Pak industries."

(1) The areas which constitute Pakistan today. being strategically vital to the late British Indian Govt. were always excluded from the industrial development programmes undertaken in Indo-Pak subcontinent before independence. This is particularly true of East Pakistan.

(2) *Heavy Expenditure.* Pakistan has to import machinery from abroad which calls for heavy expenditure. For this purpose foreign exchange is badly needed.

(3) *Competition of Foreign Goods.* It is obvious that the foreign industries which have made much progress can supply goods at very cheap rates, whereas the infant industries of Pakistan cannot supply goods at such a low cost. Therefore they find it difficult to flourish in the face of foreign competition.

(4) *Lack of Enterprise.* There is an acute dearth of people with enterprising ability and experience in Pakistan. Persons having enough capital at their disposal do not invest it in industries. They regard it risky and, therefore, invest their money in trade which promises quick and prompt returns.

(5) *Lack of Basic Minerals.* Pakistan lacks minerals like iron, petroleum, coal, etc., which are very important for the industrialisation of a country.

We have to tackle the following problems :

(i) *Scarcity of Foreign Exchange.* This is a very common difficulty of an under-developed country engaged in a dynamic programme of economic development. A backward economy subsisting on an under-developed base of agriculture and small-scale industries usually has no problem of foreign exchange. Its requirements of consumer goods are small and simple, and can be satisfied by the exchange earned by exports of food and raw materials. This easy position is liable to change to one of scarcity of foreign exchange when the country begins to import capital foods for industrialization, and the people begin to acquire new tastes and develop now requirments, such as education, health facilities, and better houses. Pakistan has entered this critical stage. The foreign exchange problem is being solved by the new Government by increasing production for exports. Now Government has resolved to rely upon our own resources.

(ii) *Maintenance of Machinery.* As the industrial development of the country proceeds, more and more machinery and equipment will be purchased and installed. This creates the important problem of maintaining the plants in a good condition. In a country using modern machinery on a large scale for the first time, maintenance is likely to be inadequate, partly because of insufficient care on the part of operating agencies, and partly because of the lack of facilities. Usually there is insufficient awareness of the risks from inadequate care, and of the benefits from adequate maintenance. The situation has been aggravated by the short supplies of spare parts resulting from scarcity of foreign exchange.

(iii) *Scarcity of Fuel and Raw Materials.* Industrial development requires increasing amounts of fuel and raw materials. There will be substantial increase in domestic supplies but not enough to dispense with imports. A careful and wise

management of foreign exchange resources is essential so that enough fuel and raw materials are imported to operate existing industrial units at economic levels, and that new plants can be established to improve the country's ability to obtain the needed supplies.

(*iv*) *Scarcity of trained personnel.* Industrial development requires a large number of persons of various capabilities and degrees of technical skill : production workers, mechanics, foremen, engineers and engineering technicians, accountants, salesmen, managers and so on. Pakistan is just beginning to have some people trained in these skills and very extensive training programmes are necessary to increase their supply.